بارہ بھائی



بارہ بھائی

بچّوں کے لیے ناول

محمد یونس حسرت

۱۹۷۵

فہرست

جنگل میں پھُول

مری، ایبٹ آباد اور اس کے ارد گرد کا علاقہ اپنی خوب صورتی کے لیے بہت مشہور رہے۔ اُونچی نیچی پہاڑیاں، ہرے بھرے جنگل، رنگ برنگے پھُول، میٹھے پانی کے چشمے اور دلکش قدرتی نظارے اس علاقے کی جان ہیں۔ سردیوں میں یہاں برف پڑتی ہے لیکن گرمیوں میں موسم خوش گوار ہوتا ہے۔ اسی لیے میدانی علاقوں میں رہنے والے لوگ گرمیاں شروع ہوتے ہی اِدھر کا رُخ کرتے ہیں اور گرمیوں کا موسم اس علاقے کے مختلف مقامات پر گزارتے ہیں۔

عرصہ ہوا، اس علاقے میں ایک عظیم الشّان ریاست تھی جس پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس بادشاہ کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام چندا تھا۔ چندا تھی تو چاند کی طرح ہی خوب صورت لیکن جس طرح چاند میں ایک داغ ہے، اسی طرح چندا میں بھی ایک بُہت بڑا عجیب تھا۔ وہ دوسروں کا کہنا بُہت ہی کم مانتی تھی۔ بس جو اپنے جی میں آتا وہی کرتی۔

بادشاہ نے شہزادی کو تعلیم دینے کے لیے ایک ماسٹر مقرّر کر رکھا تھا، لیکن چندا کی بے ڈھب طبیعت کی وجہ سے ماسٹر صاحب اُسے تعلیم دینے میں کُچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ماسٹر صاحب پڑھانے بیٹھتے تو جب تک اس کا دل چاہتا، پڑھتی اور جب اکتا جاتی تو کتاب بند کر دیتی۔ ماسٹر صاحب نے کبھی اس بارے میں بادشاہ سے شکایت نہیں کی۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر میں نے بادشاہ سے شکایت کی تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ بس یہی سوچ کر چُپکے ہو رہتے۔ وہ محل میں آتے، چندا پڑھنا چاہتی تو پڑھاتے ورنہ واپس چلے جاتے۔

پھر کرنا خُدا کا کیا ہوا کہ بادشاہ ایک دن شکار کے لیے گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ایک ہرن کا پیچھا کر رہا تھا کہ گھوڑے کو ٹھوکر لگی۔ بادشاہ لڑھک کر زمین پر گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ اس کی موت پر محل میں کئی دِن تک سوگ منایا گیا۔ بادشاہ کی بیگم تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ اب بادشاہ بھی انتقال کر گیا تو اس کے بعد چندا تخت پر بیٹھی کیونکہ اس کے سوا ریاست کا اور کوئی وارث نہیں تھا۔

چندا چودہ پندرہ سال کی ہو گی۔ اتنی عُمر میں ریاست کا انتظام سنبھالنا اس کے لیے

ممکن نہیں تھا۔ سارا کام وزیر اعظم اور دربار کے دوسرے نوکر کرتے تھے۔ لیکن چندا، جو اب ملکہ چندا بن گئی تھی، اپنے اُلٹے سیدھے حکموں سے انہیں پریشان کرتی رہتی تھی۔

شاہی محل کے پاس ہی ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا اور شہر سے کچھ فاصلے پر ایک جنگل تھا۔ سال کا آخری دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ ایک غریب لڑکی جس کا نام پھُول تھا، جنگل میں لکڑیاں چُنتی پھر رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں پر جگہ جگہ برف پڑی ہوئی تھی، اور ہوا بھی تیز اور سرد تھی۔ اس لیے پھُول کو لکڑیاں تلاش کرنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس کی خالہ نے اسے لکڑیاں لانے کے لیے بھیجا تھا۔ پھُول چاہتی تھی کہ شام ہونے سے پہلے پہلے لکڑیاں جمع کر کے گھر پہنچ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ شام کے بعد ہَوا اور زیادہ سرد ہو جائے گی اور برف بھی پڑنے لگے گی۔ پھر گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا اور شاید گھر پہنچنے پر خالہ کے ہاتھوں مار بھی کھانی پڑے۔

پھُول کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے اور اب اپنی دُور کی ایک خالہ کے ہاں رہ رہی

تھی۔ یہ عورت بڑی خود غرض اور مطلبی تھی۔پھُول کو اکثر مارتی پیٹتی رہتی تھی۔ اس کی اپنی بھی ایک لڑکی تھی جس کا نام موتی تھا۔ اسے تو وہ بڑے آرام سے رکھتی تھی اور گھر کا سارا کام بے چاری پھُول کو کرنا پڑتا تھا۔ اسے نہ تو اچھا کھانا ملتا اور نہ اچھا کپڑا۔ بچا کچا کھانا اور پھٹے پرانے کپڑے ہی اس کے حصّے تھے۔ اس وقت بھی اس نے ایک پھٹی پرانی چادر اوڑھ رکھّی تھی۔ اور سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

لکڑیاں چنتے ہوئے وہ ایک جگہ آئی تو ایک خرگوش اور گلہری کو آنکھ مچولی کھیلتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کبھی خرگوش کسی جھاڑی میں جا چھپتا اور گلہری اُسے تلاش کرتی۔ کبھی گلہری چھُپ جاتی اور خرگوش اُسے ڈھونڈنے لگتا۔پھُول انہیں یوں کھیلتے، بھاگتے اور دوڑتے دیکھ کر سردی کو بالکل بھُول گئی اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔پھُول کے قہقہے کی آواز سُن کر خرگوش اور گلہری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر جھٹ سے جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔پھُول ہنستی رہی اور ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اری لڑکی! تو کیوں ہنس رہی ہے؟“

یہ سن کر پھول چونکی اور اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک بوڑھا سا شخص کندھے پر کلہاڑی رکھے اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے سپاہیوں کی سی وردی پہن رکھی تھی۔ بوڑھے نے پھُول کے پاس آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں ہنسے جا رہی ہے لڑکی؟“

پھُول: میرا نام لڑکی نہیں۔ پھُول ہے جناب!

سپاہی نے مُسکراتے ہوئے پھُول کے کندھے پر تھپکی دی اور کہا۔

”واہ وا! کیا پیارا نام ہے۔ پھُول کا نام پھُول۔ اور ہاں میرا نام بہادُر ہے۔ لیکن تم کِس بات پر ہنس رہی تھیں پھُول بیٹی؟“

پھُول: آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔

بہادُر: میں سپاہی ہوں بیٹی اور ہم سپاہیوں نے اپنی زندگی میں ایک نہیں بے شمار عجیب و غریب باتیں دیکھیں اور سُنی ہیں۔

پھُول: لیکن ایسی عجیب بات آپ نے آج تک نہ دیکھی ہو گی اور نہ سُنی ہو گی۔ یہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک خرگوش اور گلہری آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

بہادُر: اچھا!

پھُول: جی ہاں! بالکل اسی طرح جیسے انسانوں کے بچّے کھیلتے ہیں۔

بہادُر: بڑی حیرانی کی بات ہے۔

پھُول: میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔

بہادُر: نہیں بیٹی! کوئی اور دن ہوتا تو شاید مجھے تمہاری بات کا یقین نہ آتا۔ لیکن آج سال کا آخری دن ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ تم بالکل سچ کہہ رہی ہو۔ میں نے اپنے دادا سے یہ بات سُنی ہے کہ آج کے دن ایسی ہی عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں اور یہ تو معمولی بات ہے۔ آج کے دن تو اس جنگل میں اس سے بھی زیادہ عجیب واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔

پھول: (حیرانی سے) کیسے واقعات؟

بہادُر: میرے دادا نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ ایک بار ان کے دادا نے سارے بارہ مہینوں کو اکٹھّے ایک جگہ دیکھا تھا۔

پھُول: (حیران ہو کر) سچ مُچ!

بہادُر: میں جھوٹ نہیں بولتا بیٹی! انہوں نے سارے مہینوں کو اکٹھّے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ انہوں نے یہ بات اپنے بیٹوں کو بتائی اور پھر انہوں نے اپنے بیٹوں کو اور اس طرح ہوتے ہوتے یہ بات مجھ تک پہنچی ہے۔

پھُول: لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بارہ مہینے ایک ساتھ کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ بھلا سردی کے ساتھ گرمی کیسے جمع ہو سکتی ہے!

بہادُر: میں کُچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو جو بات معلوم تھی، میں نے تمہیں بتا دی۔ لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتنی سخت سردی میں یہاں کیوں آئی ہو؟

پھُول: میں اپنی مرضی سے نہیں آئی ہوں!

بہادُر: تم کسی گھر میں مُلازم ہو؟

پھُول: نہیں جناب! بہادُر: تو پھر تمہارے ماں باپ نے بھیجا ہو گا؟

پھُول: میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ مجھے میری خالہ نے لکڑیاں لانے کے لیے بھیجا ہے۔

بہادُر: اوہو! تو تم یتیم ہو؟

پھُول: ہاں جناب! میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور میں دُور کے رشتے کی ایک خالہ کے پاس رہتی ہوں۔

بہادُر؛ کیانام ہے تمہاری خالہ کا؟

پھُول: رانی۔

بہادُر: تو تمہاری خالہ رانی بن کر خود گھر میں بیٹھی ہے اور تمہیں لکڑیاں لینے کے لیے بھیج دیا ہے۔

پھُول: ہاں جناب! اور میری خالہ کی ایک لڑکی بھی ہے۔

بہادُر: وہ بھی رانی ہی ہو گی۔ میں بھی رانی تُو بھی رانی کون بھرے گا پانی۔

پھُول: پانی بھی مَیں ہی بھرتی ہوں جناب! موتی تو گھر کا کام بالکل نہیں کرتی۔

بہادُر: اور وہ کون ہے؟

پھُول: موتی میری خالہ کی لڑکی کا نام ہے۔ خالہ اس سے کوئی کام نہیں لیتی۔ گھر کا سارا کام مُجھے کرنا پڑتا ہے۔

بہادُر: تبھی تمہاری حالت یتیموں سے بھی بدتر نظر آتی ہے۔ یہ چادر جو تم نے اوڑھ رکھی ہے، جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ یہ بھلا تمہیں سردی سے کہاں بچا سکتی ہے۔ آؤ میں تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ اس کے بعد اپنا کام کرلوں گا۔

یہ کہہ کر بہادر پھُول کے ساتھ ہو لیا اور وہ دونوں جنگل سے لکڑیاں چُننے لگے۔ جب خاصی لکڑیاں جمع ہو گئیں تو بہادُر نے کہا۔

بہادُر: بس اتنی لکڑیاں کافی ہوں گی تمہارے لیے۔ اس سے زیادہ تو تم اُٹھا بھی نہیں سکو گی۔ اب میں اپنا کام کرتا ہوں۔

پھُول: آپ کو یہاں کیا کام کرنا ہے؟

بہادُر: مُجھے کچھ شاخیں کاٹنا ہیں۔ خوبصورت اور ہری بھری شاخیں۔

پھُول: آپ ان شاخوں کا کیا کریں گے؟

بہادُر: کل نئے سال کا پہلا دن ہے۔ محل میں نئے سال کا جشن منایا جائے گا اور ان ہری بھری شاخوں سے دروازے بنائے جائیں گے۔

پھُول: اچھّا! لیکن یہ شاخیں کس نے منگائی ہیں۔

بہادُر: ہماری ملکہ چندانے۔ میں شاہی محل میں ملازم ہوں اور ملکہ کے حکم سے یہاں آیا ہوں۔

پھُول: پھر تو آپ کو جنگل کے تمام درخت کاٹنا پڑیں گے۔ آپ کو سارا محل سجانا ہو گا۔

بہادُر: نہیں بیٹے! ہمیں صرف شاہی تخت کے سامنے والے دروازے کو سجانا ہے۔ اچھا۔ تمہارا کام تو ہو چکا۔ اب مجھے کام کر لینے دو ورنہ ملکہ مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا دے گی۔ وہ کوئی عُذر سُننے کی روادار نہیں۔

پھُول: بالکل میری خالہ رانی اور موتی کی طرح۔ چاہے کوئی اپنی جان دے ڈالے، پھر بھی وہ خوش نہیں ہوتیں۔ کتنا ہی اچّھا کام ہو، اس میں بھی کیڑے ضُرور نکال دیتی ہیں۔

بہادُر: تمھیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ صبر کا پھَل میٹھا ہوتا ہے اور مُصیبت کے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔ مُصیبت کے بعد آرام اور دکھ کے بعد سُکھ ضُرور مِلتا ہے بیٹی۔

پھُول: آپ کتنے اچھّے ہیں۔ آپ نے لکڑیاں جمع کرنے میں میری مدد کی ہے۔ ابھی کُچھ دِن باقی ہے آیئے میں آپ کو ایک درخت دکھاؤں۔ وہ آپ کو ضرُور پسند آئے گا۔ اس کی شاخیں بڑی گھنی اور ہری بھری ہیں۔

بہادُر: چلو بیٹی!

اس کے بعد پھُول اور بہادر درخت دیکھنے کے لیے ایک طرف کو چل دیے۔

ملکہ کا حکم

شاہی محل میں بُوڑھے سے ماسٹر صاحب ملکہ چندا کو سبق پڑھا رہے تھے۔ ملکہ مخمل کی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر کتابیں، کاغذ، قلم اور دوات پڑی تھی۔ سامنے دیوار پر ایک تختہ سیاہ لگا ہوا تھا جس کا چوکھٹا خالص سونے کا تھا۔ سبق پڑھا چُکنے کے بعد لکھنے کی باری آئی۔

ماسٹر صاحب: ملکہ حضور! اب میں آپ کو اِملا لکھواتا ہوں۔

ملکہ: مجھے لکھنے سے نفرت ہے ماسٹر صاحب! ہاتھ اور انگلیاں سیاہی سے بھر جاتی ہیں۔

ماسٹر صاحب: (نرمی سے) آپ درست فرماتی ہیں ملکہ حضور! اِسی سے پرانے زمانے کے لوگ لکھنے کے بغیر ہی گزارا کرتے تھے اور محض دماغ سے اپنا کام چلاتے تھے۔ لیکن ان کا کام کم ہوتا تھا۔ اس لیے کام چل جاتا تھا۔ آپ کے کندھوں پر پورے ملک کا بوجھ ہے۔ اگر آپ لکھنا نہیں سیکھیں گی تو شاہی کاموں

میں گڑبڑ ہو جائے گی۔ آپ اس وقت زیادہ نہیں صرف چار سطر ہی لکھ لیجیے۔

ملکہ: (بے دلی سے قلم اُٹھاتے ہوئے) اچھا لکھوائیے۔

ماسٹر صاحب: لکھیے!

بہار آئی ہے وادی میں
کھلے ہیں پھول باغوں میں
فضا میں مسکراتی ہیں
پرندے چہچہاتے ہیں

ملکہ: مَیں تو صرف پہلی دو سطری ہی لکھوں گی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ وزیر اعظم چند کاغذات لیے اندر آیا۔ ملکہ لکھتے لکھتے رُک گئی اور وزیرِ اعظم کی طرف دیکھا۔ وزیرِ اعظم پہلے تو جھک کر آداب بجا لایا۔، پھر کہنے لگا۔ وزیرِ اعظم: مَلکہ عالیہ! اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو ان شاہی اعلانات پر دستخط فرما دیجیے۔

ملکہ :(بیزاری سے)اب ماسٹر صاحب کے ساتھ تم بھی لکھنے کا کام لے آئے۔اب میں دوسری سطر نہیں لکھوں گی۔ماسٹر صاحب!لاؤ مجھے دو یہ کاغذ۔

ملکہ نے وزیرِ اعظم سے کاغذ لے کر ان پر دستخط کر دیے۔

وزیرِ اعظم :اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو حضور تو یہاں۔۔۔۔

ملکہ :(ٹوکتے ہوئے)کچھ اور لکھنا پڑے گا۔

وزیرِ اعظم :زیادہ نہیں۔اس درخواست پر صرف ایک لفظ لکھنا ہے۔

ملکہ : کیا؟

وزیرِ اعظم :دو لفظوں میں سے ایک لفظ !پھانسی یا معافی۔

ملکہ : پھانسی۔معافی۔میں پھانسی لکھوں گی۔یہ لفظ آسان ہے۔

ملکہ نے درخواست پر پھانسی کا لفظ لکھا، اور درخواست واپس وزیرِ اعظم کو دے دی۔وزیرِ اعظم نے جھک کر آداب کیا اور باہر چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد ماسٹر صاحب نے بڑے زور کی آہ بھری۔

ماسٹر صاحب: ایک آسان لفظ نے ایک شخص کی جان لے لی۔

ملکہ: کیا مطلب؟

ماسٹر صاحب: حضور! آپ کو معلوم ہے کہ ابھی ابھی آپ نے کیا لکھا ہے؟

ملکہ: کیوں کیا بات ہے؟ کیا پھانسی کے ہجّے غلط تھے؟ کیا مجھے یہ لفظ پھ کے بجائے ف سے لکھنا چاہیے تھا؟

ماسٹر صاحب: جی نہیں حضور! ہجّے بالکل صحیح تھے۔ پھر بھی آپ نے ایک زبردست غلطی کی ہے۔

ملکہ: کیا؟

ماسٹر صاحب: آپ نے بغیر سوچے سمجھے ایک آدمی کی جان لے لی ہے۔

ملکہ: تو کیا مجھے لکھنے کے ساتھ ساتھ سوچنا بھی چاہیے۔

ماسٹر صاحب: حضور! آپ کو پہلے سوچنا چاہیے پھر لکھنا چاہیے۔

ملکہ: اگر میں آپ کے کہنے پر چلوں، تو سوائے سوچنے کے اور کچھ بھی نہ کر

سکوں۔ ہر وقت سوچتی رہوں اور سوچتے سوچتے پاگل ہو جاؤں۔ یہ بتایئے کہاں چھوڑا تھا سبق آپ نے۔

ماسٹر صاحب: اب ہم تھوڑا سا حساب کا کام کریں گے حضور! ذرا بتایئے تو سہی کہ ۸ × 7 کتنے ہوتے ہیں؟

ملکہ: مجھے نہیں معلوم۔ مجھے حساب سے بالکل دلچسپی نہیں۔ آپ کو اس سے دلچسپی ہے؟

ماسٹر صاحب: ہاں حضور! اس کے بغیر تو دنیا کے کام ہی نہیں چل سکتے۔

ملکہ: کتنی عجیب بات ہے۔ اچھا خیر اب ہمارا آج کا سبق ختم ہوتا ہے۔ آج سال کا آخری دن ہے۔ کل نئے سال کا جشن منانے کے لیے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

ماسٹر صاحب: جیسے حضور کا حکم۔

یہ کہہ کر ماسٹر صاحب میز پر سے کتابیں سمیٹنے لگے۔ ملکہ کہنیاں میز پر ٹکائے ان

کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔ ملکہ: مَیں کوئی عام لڑکی نہیں۔ اس ریاست کی ملکہ ہوں۔ ہر شخص میرا حکم مانتا ہے۔ میرے ماسٹر صاحب بھی میرا حکم مانتے ہیں۔ ماسٹر صاحب! بھلا یہ تو بتایئے کہ میری جگہ آپ کا کوئی معمولی شاگرد ہوتا اور وہ ۷ × ۸ کا جواب بتانے سے انکار کر دیتا تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟

ماسٹر صاحب: میں۔۔۔ معاف کیجیے ملکہ حضور! میں اُسے بنچ پر کھڑا کر دیتا یا پھر کان پکڑوا کر مرغا بنا دیتا۔

ملکہ : آپ بڑے ظالم ہیں ماسٹر صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ میں چاہوں تو بھی آپ کو پھانسی پر لٹکا سکتی ہوں۔

ماسٹر صاحب: (ڈرتے ہوئے) ملکہ حضور!

ملکہ : ہاں! ہاں! میں آپ کو پھانسی پر چڑھا سکتی ہوں اور آپ ہیں بھی اسی قابل۔

ماسٹر صاحب: لیکن میں نے تو کوئی جُرم نہیں کیا حضور! آخر میری خطا کیا ہے؟

ملکہ : میں جب کُچھ لکھتی ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے اور جب آپ کے کسی سوال کا جواب دیتی ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں تو ایسے لوگوں کو پسند کرتی ہوں جو ہر بات میں مُجھ سے اتفاق کریں۔

ماسٹر صاحب: میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کروں گا۔

ملکہ : آپ وعدہ کرتے ہیں! بُہت خُوب۔ اس صورت میں ہم اپنا سبق پھر شروع کرتے ہیں۔ مُجھ سے کُچھ سوال پوچھیے۔

ماسٹر صاحب: ملکہ حضور! ٦ × ٦ کتنے ہوتے ہیں؟

ملکہ : (مُسکرا کر) گیارہ!

ماسٹر صاحب: (غمگین ہو کر) بالکل ٹھیک ہے ملکہ حضور! اور اب بتایئے کہ ٨ × ٨ کتنے ہوئے؟

ملکہ : تین!

ماسٹر صاحب: ٹھیک۔ ملکہ حضور! اب بتائیے کہ۔۔۔۔

ملکہ :(ٹوک کر) اب آپ مجھ سے سوال ہی پوچھتے چلے جائیں گے، کوئی دلچسپ بات کیوں نہیں سناتے؟

ماسٹر صاحب: آپ کوئی دلچسپ بات سُننا چاہتی ہیں؟

ملکہ :ہاں۔

ماسٹر صاحب: بُہت بہتر! یہ بات کس بارے میں ہو؟

ملکہ :مجھے نہیں معلوم۔ کل نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ آپ مجھے نئے سال کے بارے میں کُچھ بتائیے۔

ماسٹر صاحب: بُہت اچھّا۔ کل نیا سال شروع ہو گا۔ ایک سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔

ملکہ :کیا واقعی؟

ماسٹر صاحب: جی ہاں ملکہ حضور! اور یہ بارہ مہینے ہیں جنوری، فروری، مارچ،

اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر۔

ملکہ : ارے اتنے! تعجّب ہے کہ آپ کو ان سب کے نام یاد ہیں۔ آپ کی یادداشت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ماسٹر صاحب: شکریہ ملکہ حضور! اور یہ مہینے ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ جب ایک مہینہ ختم ہو جاتا ہے تو دوسرا شروع ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اپریل مارچ سے پہلے آجائے یا ستمبر اگست سے پہلے آجائے۔

ملکہ : اور اگر میں چاہوں کہ اپریل ابھی آجائے تو؟

ماسٹر صاحب: ایسا نہیں ہو سکتا ملکہ حضور !

ملکہ : آپ پھر مجھے جھُٹلا رہے ہیں ماسٹر صاحب!

ماسٹر صاحب: میں آپ کو جھُٹلا نہیں رہا حضور! یہ قدرت کا قانون ہے اور قدرت کے قانون کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

ملکہ : اچھا! لیکن فرض کیجیے میں ایسا قانون بنا دیتی ہوں اور اس پر شاہی مہر بھی لگا

دیتی ہوں۔ تو پھر؟

ماسٹر صاحب: اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا حضور! اور پھر آپ کو مہینوں میں کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہر مہینہ آپ کے لیے طرح طرح کے تحفے لے کر آتا ہے۔ جنوری اور فروری میں برف پڑتی ہے اور ہر طرف چاندی کی چادر بچھ جاتی ہے۔ پھر مارچ میں برف پگھلنے لگتی ہے اور اپریل میں پگھلی ہوئی برف کے نیچے سے چاندنی کے ننھے ننھے پھُول جھانکنے لگتے ہیں۔۔۔

ملکہ : اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اب اپریل کا مہینہ آ جائے۔ مجھے چاندنی کے پھُول بہُت پسند ہیں۔ میں نے آج تک یہ پھُول نہیں دیکھے۔ سنا ہے بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ آپ نے یہ پھُول دیکھے ہی ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب: جی ہاں ملکہ حضور!

ملکہ : مجھے ان کے متعلق کچھ بتائیے!

ماسٹر صاحب: بہت بہتر حضور! چاندنی کے پھُول ننھے ننھے اور سفید رنگ کے

ہوتے ہیں۔ انہیں چاندنی اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ پھُول صرف چاندنی رات ہی میں کھِلتے ہیں، اور یہ اپریل کے شروع میں کھلتے ہیں۔ اس سے پہلے نہیں۔

ملکہ : اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ اپریل کا مہینہ شروع ہو جائے۔ مجھے چاندنی کے پھُول چاہیں۔

ماسٹر صاحب: تو اس کے لیے آپ کو اپریل تک انتظار کرنا پڑے گا اور اپریل کوئی زیادہ دُور بھی نہیں ہے۔ صرف تین مہینے یعنی نوّے دِن رہتے ہیں۔

ملکہ : نوّے دن؟ مَیں تو تین دن بھی انتظار نہیں کر سکتی! کل نئے سال کا جشن ہے اور اس جشن کے لیے میری میز پر چاندنی کے پھُول ہونے چاہیں۔

ماسٹر صاحب: لیکن ملکہ حضور! یہ قدرت کا قانون۔۔۔۔

ملکہ : (ٹوکتے ہوئے) میں خود قدرت کا ایک نیا قانون بناؤں گی۔ اِدھر میری جگہ پر آ کر بیٹھیے اور جو کُچھ میں لکھواتی ہوں، لکھیے۔

یہ کہہ کر ملکہ چندا اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ماسٹر صاحب جھجکتے

ہوئے اس کی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ ملکہ نے ماسٹر صاحب کو لکھوانا شروع کیا۔

ملکہ : لکھیے ماسٹر صاحب ! ہم یہ حکم صادر کرتے ہیں کہ کل نئے سال کے جشن کے موقع پر چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری ہمارے محل میں پہنچادی جائے۔ جو شخص ہمارے اس حکم کی تعمیل کرے گا، ہم اسے بھاری انعام دیں گے۔ اس کی ٹوکری خالص سونے کی اشرفیوں سے بھر دیں گے اور اسے ایک نہایت خوبصورت گرم چُغہ بھی دیں گے۔

ماسٹر صاحب لکھ چکے تو ملکہ چندا نے قلم اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور کاغذ پر اپنے دستخط کیے۔ اس کے بعد اس نے وزیرِ اعظم کو طلب کیا۔

ملکہ :(وزیرِ اعظم سے) دیکھو! یہ ہمارا فرمان ہے۔ اس پر شاہی مہر لگاؤ اور سارے شہر میں اس کی منادی کرادو تاکہ ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے۔

وزیرِ اعظم :(کاغذ پڑھ کر) اس پر شاہی مُہر لگاؤں ملکۂ عالیہ ؟ بُہت اچّھا! بُہت اچّھا! جیسے آپ کا حکم !

ملکہ : یہ ہمارا فرمان ہے اور تمہیں اس کی فوراً تعمیل کرنی چاہیے۔

وزیر اعظم جھک کر آداب بجالایا اور کاغذ لے کر چلا گیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہی شاہی ڈھنڈورچی شہر کے گلی کوچوں میں ملکہ کے اس عجیب و غریب فرمان کی منادی کرتے پھر رہے تھے۔

چاندنی کے پھُول

پھُول کی خالہ رانی اور اس کی لڑکی موتی نے جب یہ سُنا کہ ملکہ چندا نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جو چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری محل میں پہنچائے گا اسے ان پھولوں کے عوض وہی ٹوکری اشرفیوں سے بھر کے انعام میں دی جائے گی تو وہ دونوں ماں بیٹی سر جوڑ کر بیٹھیں اور جنگل سے چاندنی کے پھُول لانے کے بارے میں سوچنے لگیں۔ موتی پرلے درجے کی لالچی تھی۔ وہ گھر میں پڑی ہوئی چھوٹی بڑی تمام ٹوکریاں اکٹھی کر لائی اور انہیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

موتی: (سب سے چھوٹی ٹوکری ہاتھ میں لے کر) تمہارا کیا خیال ہے امّاں! اس میں کافی اشرفیاں آجائیں گی؟

رانی: ہاں بیٹی!

موتی: ان اشرفیوں سے کمخواب کا ایک سُوٹ بن جائے گا؟

رانی: ایک سوٹ! اِن سے تو ہزار سُوٹ بن جائیں گے۔

موتی : (ایک اور ٹوکری اٹھاتے ہوئے) اور اس میں کتنی اشرفیاں آ جائیں گی امّاں؟

رانی: اس میں اس سے ذرا زیادہ آجائیں گی۔ ان اشرنوں سے ہم ایک بڑا سا مکان بنوا سکتے ہیں۔

موتی:(ایک اور ٹوکری لاتے ہوئے) اور اس میں کتنی اشرفیاں آئیں گی امّاں؟

رانی: اس میں! اس میں تو اِتنی اشرفیاں سما سکتی ہیں بیٹی کہ تم اپنے گھر کے سارے برتن سونے کے بنوا سکتی ہو۔ برتن ہی نہیں، کپڑے اور جوتے بھی۔

موتی :تو پھر میں یہی ٹوکری لے جاؤں گی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ آج کل چاندنی کا پھُول تو کیا، پودا بھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔ ہر طرف برف ہی برف جمی ہوئی ہے۔

رانی: ملکہ کو تو ہمیشہ اُلٹی ہی باتیں سُوجھتی ہیں۔ بھلا یہ موسم چاندنی کے پھولوں کا

ہے؟

موتی: ہو سکتا ہے کہ برف کے نیچے پھُول ہوں۔ میں اپنی چادر اُوڑھ کر جاتی ہوں اور ان کو تلاش کرتی ہوں۔

رانی: نا میری بیٹی! میں تمھیں گھر سے باہر نہیں جانے دوں گی۔ ذرا دیکھو تو سہی۔ باہر کتنی برف پڑی ہے۔

موتی: (سب سے بڑی ٹوکری اُٹھاتے ہوئے) میں ضرور جاؤں گی۔ ایسا موقع زندگی میں بار بار نہیں آتا اور میں اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتی۔

رانی: تم جنگل میں گئیں تو سردی سے اکڑ کر مر جاؤ گی۔

موتی: تو پھر تم جاؤ اور چاندنی کے پھُولوں سے ٹوکری بھر لاؤ۔۔۔ میں انھیں محل میں لے جاؤں گی۔

رانی: کیا کہنے ہیں میری لاڈلی کے، ایسے طوفان میں تو کوئی اپنے کتّے کو بھی گھر سے باہر نہیں دھکیلتا اور تُم مجھے جنگل میں جانے کے لیے کہ رہی ہو۔

موتی: تم میرے لیے اتنی سی تکلیف بھی نہیں کر سکتیں؟

یہ کہہ کر موتی نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ رانی بیٹی کے اس طرح رونے سے گھبرا گئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

رانی: نہ رو میری بیٹی! نہ رو۔ لو میں تمہارے لیے حلوا تیار کرتی ہوں۔۔۔ ابھی کرتی ہوں۔

موتی: (روتے ہوئے) مجھے حلوا نہیں چاہیے، چاندنی کے پھول چاہیں۔ تم نہ خود جاتی ہو اور نہ مجھے جانے دیتی ہو۔ تو پھر پھُول سے کہو کہ جائے۔ وہ جنگل سے لکڑیاں لے کر ابھی واپس آ جائے گی۔ تم اُسے چاندنی کے پھول لینے کے لیے بھیج دو امّاں!

رانی: ہاں! بات تم نے عقل کی کی ہے بیٹی۔ میرا بھی یہی خیال ہے اسے ہی بھیجوں۔ جنگل کوئی زیادہ دور تو ہے نہیں۔ اسے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اگر وہ چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری لے آئی تو کل ہم دونوں یہ ٹوکری محل میں لے جائیں گے اور اگر وہ کہیں برف کے نیچے دب کر مر گئی تو اس کی قسمت۔

موتی: مُجھے اس سے سخت نفرت ہے امّاں! وہ برف کے نیچے دب کر مر بھی گئی تو مجھے افسوس نہیں ہو گا۔ تم اسے یہ ٹوکری دینا۔ یہ کافی بڑی ہے۔

رانی: نہیں بیٹی! ہم یہ چھوٹی ٹوکری اُسے دیں گے۔ بڑی ٹوکری تو میں نے پرسوں ہی خریدی ہے۔ اگر وہ برف میں دب کر مر گئی تو اس کے مرنے سے زیادہ مجھے ٹوکری کے ہاتھ سے جانے کا افسوس ہو گا۔

موتی: یہ تو بالکل ہی چھوٹی سی ہے امّاں! پر خیر۔ وہ یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ پھُول لکڑیاں لیے اندر داخل ہوئی۔ لکڑیوں کا گٹھّا اس نے ایک طرف پھینکا، چادر پر سے برف جھاڑی اور پھر چولھے کے قریب آ کر ہاتھ تاپنے لگی۔ رانی نے پھُول کی طرف دیکھا، جیسے اس کی حالت سے باہر کے موسم کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر بولی۔

رانی: کیا باہر بہت برف پڑ رہی ہے پھُول بیٹی؟

پھُول: ہاں خالہ! مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں بادلوں پر چل رہی ہوں، حیران ہوں کہ گھر خیریت سے کیسے پہنچ گئی!

رانی: سردیوں میں تو برف پڑا ہی کرتی ہے۔

پھُول: لیکن اتنی برف تو آج تک نہیں پڑی خالہ! اور ابھی اور پڑے گی۔ شاید رات بھر پڑے گی۔

رانی: یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟

پھُول: یہ تو سیدھی سی بات ہے خالہ! آج سال کا آخری دِن ہے نا۔

رانی: تم یونہی سردی سردی اور برف برف کر رہی ہو۔ تمھیں سردی لگ رہی ہوتی تو اس طرح لہک لہک کر باتیں نہ کرتیں۔ خیر اب تم نے کافی دیر آگ تاپ لی ہے۔ تمھیں ایک اور جگہ جانا ہے۔

پھُول: کہاں؟

رانی: زیادہ دور نہیں۔ جنگل تک ہی جانا ہے۔

پھول: (حیرانی سے) جنگل تک! لیکن کیوں؟ میں تو اتنی لکڑیاں لے آئی ہوں جو ایک ہفتے کے لیے کافی ہو سکتی ہیں۔

رانی: تم سے اور لکڑیاں کون منگوا رہا ہے۔ تمہیں تو وہاں سے چاندنی کے پھُول لانا ہیں۔

پھُول: چاندنی کے پھول اور اس موسم میں؟ مُجھے معلوم نہیں تھا کہ تُم مذاق کر رہی ہو۔۔۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔

موتی: میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ تم نے شاہی اِعلان نہیں سُنا ہے؟

پھُول: نہیں۔

موتی: تمہیں تو پتا ہی کُچھ نہیں۔ شہر کے ہر شخص کے ہونٹوں پر اس اعلان کا ذکر ہے۔ ملکہ نے اعلان کیا ہے کہ جو شخص نئے سال کے جشن کے لیے چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری محل میں پہنچائے گا، اسے ان پھولوں کے عوض وہی ٹوکری سونے کی اشرفیوں سے بھر کر انعام میں دی جائے گی اور اسے ایک خوبصورت گرم چُغہ بھی ملے گا۔

پھُول: یہ تو چاندنی کا موسم ہی نہیں ہے۔۔۔ یہ پھُول تو اپریل میں کھلتے ہیں۔

رانی: اگر موسم ہوتا تو پھر سونے کی اشرفیاں کون دیتا؟

موتی: خیر اب زیادہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں! یہ ٹوکری لو اور جاؤ۔

پھُول: لیکن اب تو شام ہو رہی ہے۔ رانی: اس میں تمہارا اپنا قصور ہے۔ تمھیں لکڑیاں لانے میں اتنی دیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔

پھُول: کل صُبح چلی جاؤں گی خالہ! اس وقت وہاں جانا تو موت کو دعوت دینا ہے۔

رانی: کل صبح؟ ابھی جاؤ۔ کل صبح کو تو وہ پھُول ملکہ کی خدمت میں پیش کرنا ہیں۔

پھُول: بھلا اس موسم میں چاندنی کے پھُول کہاں ہوتے ہیں خالہ! اور پھر اندھیرا ہو رہا ہے۔

رانی: ذرا جھک کر غور سے دیکھنا۔

پھُول: میں نہیں جاؤں گی۔

موتی: تم نہیں جاتیں تو نہ جاؤ۔ میں جاتی ہوں۔ تم یہاں چولھے کے پاس بیٹھ کر آگ تاپتی رہو۔

یہ کہہ کر موتی نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی چادر کھینچی اور اسے لپیٹ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن رانی نے اُسے پکڑ لیا اور غصّے سے کہنے لگی۔

رانی: کہاں جا رہی ہو؟ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ خبر دار جو تم نے باہر جانے کا نام بھی لیا اور سنو پھُول! فوراً جاؤ۔۔۔ یہ ٹوکری ساتھ لے جاؤ اور چاندنی کے پھُولوں سے بھر کے لاؤ۔ اگر مجھے پتا چل گیا کہ تم جنگل میں جانے کے بجائے کسی پڑوسن کے گھر بیٹھ رہی ہو تو میں مار مار کر تمہاری کھال اُدھیڑ دوں گی۔

یہ سن کر پھُول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن اس نے جلدی سے پونچھ ڈالے۔ اس نے اپنی میلی اور پھٹی پرانی چادر کو اچھی طرح اپنے ارد گرد لپیٹا اور ٹوکری اُٹھا کر خاموشی سے باہر نکل گئی۔

پھُول کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں ماں بیٹی خاموشی سے آگ تاپتی رہیں۔ پھر سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا تو رانی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ شاید پھُول باہر جاتے وقت دروازہ اچھی طرح بند کر کے نہیں گئی تھی۔

رانی: کم بخت دروازہ بھی تو بند کر کے نہیں گئی۔ ایسی پھوہڑ لڑکی بھی کسی کے گھر نہ ہو۔ موتی بیٹی! ذرا اُٹھ کر دروازہ تو اچھی طرح بند کر آؤ۔ پھر میں تمہیں کھانا دیتی ہوں۔ کہو تو تمہارے لیے تھوڑا سا حلوا بھی بنا دوں۔۔۔

حلوے کا نام سُن کر موتی خوش خوش اُٹھی اور دروازہ بند کر کے پھر چولھے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گرم گرم حلوا کھا رہی تھیں اور بے چاری پھُول ٹوکری ہاتھ میں لیے جنگل میں چاندنی کے پھُولوں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔

ڈیرا بارہ بھائیوں کا

پھول جنگل میں پہنچی تو شام ہو چکی تھی، مغرب میں شفق کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف روئی کی طرح برف کے گالے گر رہے تھے۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتی آگے بڑھتی گئی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چاندنی کے پھول کہاں سے حاصل کرے؟ اس جنگل میں وہ اکثر آتی رہتی تھی۔ جنگل کا زیادہ حصّہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ اس لیے شام ہو جانے کے باوجود اس کو کوئی خاص ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

کُچھ دُور آگے جا کر وہ رک گئی اور سوچنے لگی کہ مجھے نہ تو کہیں سے چاندنی کے پھُول ملیں گے اور نہ میں یہاں سے زندہ واپس جا سکوں گی۔ پھر اگر مرنا ہی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں یہاں مروں یا کُچھ آگے جا کر۔ اب تو اندھیرا ہو چکا ہے۔ میں نہ اپنا راستہ تلاش کر سکتی ہوں اور نہ آسانی سے واپس ہی جا سکتی ہوں۔ میرا مرنا یقینی ہے۔

پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں کسی کو مدد کے لیے پکاروں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شکاری یا لکڑہارا جنگل میں موجود ہو اور میری آواز سن کر مدد کو آ پہنچے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی آواز سے دو تین بار پُکارا۔

"کوئی ہے؟ کوئی ہے؟"

لیکن جب کوئی جواب نہ آیا اور ہر طرف خاموشی ہی رہی تو وہ سوچنے لگی کہ میں بھی کتنی نادان ہوں۔ بھلا اس وقت برف کے اس طوفان میں کون شکاری یا لکڑہارا یہاں ہو سکتا ہے۔ میں ہی اس جنگل میں اکیلی ہوں اور چاندنی کے پھولوں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔

وہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نہ میں آگے جا سکتی ہوں کہ اندھیرے میں راستہ تلاش کرنا مشکل ہے۔ نہ واپس جا سکتی ہوں کہ پیچھے بھی کُچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر میں یہیں کھڑی رہی تو برف کے گالوں میں دب کر رہ جاؤں گی۔ بہتر یہ ہے کہ کسی درخت پر چڑھ جاؤں۔ سردی سے نہ سہی، برف سے تو محفوظ رہوں گی۔

یہ سوچ کر وہ ایک درخت پر چڑھ گئی، اور ایک شاخ پر بیٹھ کر دوسری شاخ سے ٹیک لگالی۔ تھکی ہوئی تو وہ پہلے ہی تھی۔ ٹیک لگاتے ہی نیند آ گئی۔ اسی حالت میں اس نے ایک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی مرحوم ماں کے ساتھ گھر میں گھوم پھر رہی ہے۔ماں کے ہاتھوں میں ایک مشعل ہے جس کی روشی سیدھی اس کی آنکھوں میں پڑ رہی ہے اور یہ روشنی سے بڑی پیاری معلوم ہو رہی ہے۔

پھر دَھپ سے برف کا ایک چھوٹا سا گالا اس کے سر پر پڑا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک آواز اس کے کان میں آئی۔

"پھُول بیٹی! مت سوؤ نہیں تو سردی سے اکڑ جاؤ گی۔"

پھُول نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آواز اس کی اپنی ماں کی ہے لیکن وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کہنے لگی۔

"ماں! تم کہاں ہو؟"

لیکن وہاں کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ یہ تو اس کا وہم تھا۔

پھر اس نے سامنے کی طرف دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اُسے کچھ فاصلے پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی اس نے خواب میں دیکھی تھی۔ وُہ جلدی جلدی درخت سے اُتری اور آگے کی سمت میں چل دی۔

سردی سے اس کی ٹانگیں سُن ہو چکی تھیں لیکن آگ نظر آ جانے سے اس میں ایک جوش سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جھاڑیوں سے اُلجھتی، درختوں سے ٹکراتی، گرتی پڑتی آگ کی طرف بڑھتی گئی اور آخر وہاں جا پہنچی جہاں ایک تھوڑی سی کھلی جگہ پر آگ کا الاؤ روشن تھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گئی اور آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

وُہ کل بارہ آدمی تھے اور الاؤ کے گرد بیٹھے آگ تاپ رہے تھے، ان میں تین بوڑھے تھے۔ ان کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں اور انہوں نے لمبے لمبے بالوں کی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کے جسم پر بھی لمبے لمبے بالوں والے چغے سے تھے۔ تین شخص درمیانی عمر کے تھے، تین نوجوان تھے اور تین بالکل لڑکے معلوم ہو

رہے تھے۔ نوجوان اور لڑکے آگ کے قریب اور بوڑھے اور درمیانی عمر کے شخص ذرا سے ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

ان سب نے سفید، سبز، سنہری، سُرخ اور پیلے رنگوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ اصل میں یہ بارہ مہینے جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر تھے جو سال کی آخری شام کو جمع ہو کر اپنا جشن منا رہے تھے۔ پھر انہوں نے خوش ہو کر گیت گانا شروع کیا۔

اے آگ تیز اور تیز جل
شُعلہ تیرا اُونچا رہے

جنوری: (تھوڑی سی لکڑیاں آگ پر پھینکتے ہوئے):

اے آگ روشن ہو ذرا
کر گرم سردی کی ہوا
گرمی کے چہرے کو نکھار

دنیا میں لے کر آ بہار

تمام مہینے:(مل کر)

اے آگ تیز اور تیز جل

شُعلہ ترا اونچا رہے

مارچ :

اے آگ تیز اور تیز جل

یہ برف سب جائے پگھل

سر سبز ہوں سب جھاڑیاں

اُگ آئیں پھر پھُول اور پھل

تمام مہینے:(مل کر)

اے آگ تیز اور تیز جل

شُعلہ ترا اونچا رہے

اپریل :

اے آگ تیز اور تیز جل
کر دے سنہری کھیتیاں
سونا ہی سونا کھیت ہوں
گندم کی جھُومیں بالیاں

تمام مہینے:(مل کر)

اے آگ تیز اور تیز جل
شُعلہ ترا اونچا رہے

پھُول انہیں گیت گاتے اور آگ تاپتے دیکھتی رہی۔ اُسے سردی بھی لگ رہی تھی مگر آ کے جانے کی ہمّت بھی نہیں ہوتی تھی۔ آخر اس نے حوصلے سے کام لیا

اور درخت کی اوٹ سے نکل کر اُن کے قریب جا پہنچی اور زور سے انہیں سلام کیا۔ اُس کے سلام کی آواز سُن کر وُہ سارے چونک گئے اور حیرانی سے پھُول کی طرف دیکھنے لگے۔

جنوری نے کہا:

جنوری: کون ہو تم؟

پھُول: میرا نام پھُول ہے بابا! مُجھے سردی لگ رہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کُچھ دیر آگ تاپ لوں۔

جنوری: (دوسرے مہینوں سے) کیا خیال ہے تمہارا بھائیو! ہم اس لڑکی کو آگ تاپ لینے کی اجازت دے دیں؟

فروری: (سر ہلاتے ہوئے) اس سے پہلے کبھی کسی اجنبی نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر آگ نہیں تاپی۔

اپریل: ٹھیک ہے۔ لیکن یہ غریب لڑکی تاپ لے تو کیا حرج ہے۔

مئی: اسے آگ تاپ لینے دو بھائیو! یہ لڑکی تاپ لے گی تو ہماری آگ ٹھنڈی تھوڑی ہو جائے گی۔

دسمبر: (داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) لڑکی! آؤ یہاں آکر آگ تاپ لو۔

پھُول: آپ کا بے حد شکریہ بابا!

یہ کہہ کر پھُول آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی الاؤ کے قریب آئی اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ آگ تاپنے سے اس کی جان میں جان آ گئی۔ ہاتھ پیر جو سردی سے سُن ہو گئے تھے، گرم ہو گئے۔ وہ احسان مندی سے اپنے محسنوں کی طرف دیکھنے لگی۔

پھر جنوری کی نظر اس ٹوکری پر پڑی جو پھُول کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کہا۔

جنوری: یہ ٹوکری کیسی ہے تمہارے ہاتھ میں؟ تم ایسے طوفان میں شام کے وقت جنگل میں کیا لینے آئی ہو؟

پھُول: میں اپنی مرضی سے نہیں آئی ہوں بابا! میری خالہ نے مجھے چاندنی کے

پھُول لینے کے لیے بھیجا ہے؟



مارچ: (قریب بیٹھے ہوئے اپریل کے کہنی مارتے ہوئے) سنا بھائی تم نے نے؟ یہ لڑکی چاندنی کے پھُول لینے آئی ہے۔ سو یہ تمہاری مہمان ہے۔

مارچ کی بات سُن کر تمام مہینے ہنس پڑے۔

پھُول: کاش میں بھی آپ کی ہنسی میں شامل ہو سکتی، لیکن مجھے ہنسی نہیں رونا آرہا ہے۔ اگر میں خالی ہاتھ گھر واپس آئی تو خالہ مار مار کر میری ہڈیاں توڑ ڈالے گی۔

فروری: تمہاری خالہ کو سردیوں میں چاندنی کے پھُولوں کی کیا ضرورت پڑ گئی۔

پھُول: اُسے پھُول نہیں اشرفیاں چاہیں۔ ہماری ملکہ نے اعلان کیا ہے کہ جو کوئی نئے سال کے جشن کے لیے چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری محل میں پہنچائے گا۔ اسے ان پھُولوں کے عوض وہی ٹوکری اشرفیوں سے بھر کر انعام میں دی جائے گی۔ اسی لیے میری خالہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔

جنوری: تم بڑی نادان ہو بیٹی! تمہیں معلوم نہیں کہ یہ چاندنی کے پھولوں کا موسم نہیں ہے۔ اس کے لیے تو تمہیں اپریل کے مہینے کا انتظار کرنا پڑے گا۔

پھُول: میں جانتی ہوں بابا! لیکن میں یہاں نہ آتی تو اور کہاں جاتی؟ خیر آپ کی بُہت بُہت مہربانی کہ آپ نے مجھے آگ تاپ لینے دی ورنہ سردی کی وجہ سے میں اب تک مر چکی ہوتی۔ میں آپ کی بُہت شکر گزار ہوں۔

یہ کہہ کر پھُول جانے لگی۔

اپریل: ٹھہرو لڑکی!

پھُول رُک گئی۔ اس نے اپریل کی طرف دیکھا۔ اپریل اپنی جگہ سے اُٹھا اور بوڑھے جنوری کے پاس آکر بولا۔

اپریل: جنوری بھائی! تم ایک گھنٹے کے لیے اپنی جگہ مُجھے دے دو تو بڑی مہربان ہو گی۔

جنوری: مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اپریل مارچ سے پہلے نہیں آسکتا۔

مارچ: تم میری فکر نہ کرو۔ فروری بھائی تمہارا کیا خیال ہے؟

فروری: جیسے تم کہو مارچ بھیّا! میں تم سے جھگڑا تھوڑی کروں گا۔ میں بھی ایک

گھنٹے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔

جنوری: یہ بات ہے تو پھر میں ہٹا جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر جنوری نے اپنا ڈنڈا زمین پر مارا۔ ڈنڈے کے زمین پر پڑتے ہی برف کا طوفان تھم گیا۔ جنگل میں خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد جنوری نے وہی ڈنڈا فروری کئے ہاتھ میں تھما دیا۔ فروری نے بھی ڈنڈا جنوری کی طرح زمین پر مارا تو نہایت تیز اور سرد ہوا چلنی شروع ہو گئی۔ اس کے بعد فروری نے ڈنڈا مارچ کے ہاتھ میں دے دیا۔ مارچ نے ڈنڈا زمین پر مارا تو برف پگھلنی شروع ہو گئی۔ درختوں میں پتّے نکلنے لگے اور جھاڑیاں سبز ہونے لگیں۔ پھر مارچ نے ڈنڈا اپریل کو تھما دیا۔ ڈنڈا اپریل کے ہاتھ میں آتے ہی اس پر خوبصورت ہرے بھرے پتّے نکل آئے۔ اپریل نے ایک بچّے کی طرح جوش میں آ کر ڈنڈا زمین پر مارا تو ہر طرف بہار ہی بہار نظر آنے لگی۔ زمین پر گھاس نمودار ہو گئی۔ درختوں پر نیلے پیلے پھُول نکل آئے اور اِدھر اُدھر پگھلتی ہوئی برف کے پیچھے سے چاندنی کے ننھے منّے سفید پھول جھانکنے لگے۔ پھُوں حیران کھڑی یہ سب کُچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کو حیرت میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر

اپریل نے کہا۔

اپریل: تم کیوں اس طرح حیران کھڑی ہو لڑکی! جلدی کرو۔ میرے بھائیوں نے مجھے اور تمہیں صرف ایک گھنٹے کی مہلت دی ہے۔

پھُول: لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہو کیا گیا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟

اپریل: یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔ جلدی کرو اور چاندنی کے پھولوں سے اپنی ٹوکری بھر لو۔ تم نے جلدی نہ کی تو تمہاری ٹوکری بھرنے سے پہلے پہلے ہی دوبارہ سردی آجائے گی۔

پھُول: اچھّا میں جاتی ہوں۔

پھُول ٹوکری سنبھال کر پھول چُننے کے لیے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بارہ مہینے پھر باتیں کرنے لگے۔

جنوری: میں نے تو اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا بھائیو! میں نے اسے اکثر جنگل میں

دیکھا ہے۔ کئی سال سے وہ یہی پھٹی پرانی چادر اوڑھے ہوتی ہے بے چاری۔

جُون: میں بھی اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔

اگست: میں نے کئی بار اس کو بارش میں بھگویا ہے۔ مجھے اس کا افسوس ضرور ہے لیکن برسات کے مہینے کا تو کام ہی یہی ہے۔

ستمبر: وُہ بہت پیاری اور نیک دل لڑکی ہے۔

اپریل: میرا بھی یہی خیال ہے۔ اور اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو میں نشانی کے طور پر اسے ایک انگوٹھی دے دوں۔

دسمبر: ہماری طرف سے اجازت ہے بھائی! جو جی میں آئے کرو۔

اتنے میں پھُول واپس آگئی۔ اس کی ٹوکری چاندنی کے ننھے منّے سفید پھولوں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جنوری نے کہا۔

جنوری: ارے! تم اتنی جلدی ٹوکری بھر لائیں۔

پھُول: وہاں تو ہر طرف پھول ہی پھول ہیں بابا! پہاڑیوں پر، پہاڑوں کے نیچے،

درختوں کے نیچے، پتھروں کے نیچے۔۔۔۔ میرے اللہ! میں نے آج اتنے پھُول کبھی نہیں دیکھے۔۔۔ اور اتنے پیارے پیارے کہ میں کیا کہوں! اگر آپ میری امداد نہ کرتے تو مجھے بہار کے یہ پھُول دوبارہ دیکھنے کبھی نصیب نہ ہوتے۔ جب تک میرے جسم میں جان ہے، میں آپ کا شکریہ ادا کرتی رہوں گی۔

جنوری: تمہیں میرا نہیں، میرے بھائی اپریل کا شکریہ ادا کرنا چاہیے بیٹی! اس نے تمہاری سفارش کی اور اسی نے تمہاری خاطر برف کے نیچے سے یہ پھُول نکالے ہیں۔

پھُول: (اپریل کی طرف مڑ کر) اپریل بھیّا! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھُولوں گی۔

اپریل: میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم مُجھے کبھی نہ بھولو (اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر پھول کی طرف بڑھاتے ہوئے) لو! میں تمہیں یہ انگوٹھی نشانی کے طور پر دیتا ہوں۔ یہ انگوٹھی تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔ اگر کبھی تم پر کوئی مشکل وقت آئے تو اس انگوٹھی کو زمین پر، پانی میں یا برف کے گالے میں پھینک دینا اور پھر

یہ گیت گانا۔

چل ری میری انگوٹھی چل
ہو کے بہار کی وادی سے
آگے ہے گرمی کا محل
اس میں سے تو گزر چل
آگے خزاں کی بستی ہے
اس کو چھوڑ اور آگے چل
اجلا، اجلا، سردی کا
آگے ملے گا غالیچہ
اس پر سے تو گزرتی چل
اس سے آگے ڈیرا ہے
میرے بارہ بھائیوں کا
تیز ہے روشن آگ جہاں

جلدی　　سے　　تو　　پہنچ　　وہاں

چل　　ری　　مری　　انگوٹھی　　چل

اور جب تم یہ گیت گاؤ گی تو ہم سارے بھائی بارہ کے بارہ مہینے تمہاری مدد کو پہنچ جائیں گے۔

پھُول: اچھّا!

پھُول نے وہ گیت دُہرایا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اپریل نے کہا تھا۔

اپریل: ٹھیک ہے۔ اور دیکھنا اس انگوٹھی کو حفاظت سے رکھنا۔ اگر تم نے یہ انگوٹھی گُم کردی تو گویا ہمیں گُم کر دیا۔

پھُول: مَیں اسے گم نہیں کروں گی اور نہ اسے اپنے آپ سے جدا کروں گی۔ میں اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھوں گی۔

جنوری: اچھی بات ہے۔ اب تم آئی ہو تو لگے ہاتھوں میں اپنے سب بھائیوں کا تعارف بھی تم سے کرا دیتا ہوں۔ کیا خیال ہے بھائیو تمہارا؟

تمام مہینے: (ایک ساتھ) ٹھیک ہے! ٹھیک ہے۔

جنوری: پہلے میں اپنا ہی تعارف کراتا ہوں۔ دیکھو بیٹی! جنوری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ میں آتا ہوں تو اپنے ساتھ، برف کا طوفان لاتا ہوں جس سے ڈر کر لوگ اپنے گھروں کے اندر بند ہو کر یا تو آگ تاپتے رہتے ہیں یا نرم گرم لحافوں اور کمبلوں میں گھُسے رہتے ہیں۔ باہر نکلتے ہیں تو گرم کپڑے پہن کر اور منہ سر اچھی طرح لپیٹ کر۔ ذرا کسی نے بے احتیاطی کی اور وہیں اسے نزلہ زکام ہوا۔ جنوری میں باغبان اور مالی اپنے باغوں میں نئے پودے لگانے کے لیے زمین تیار کرتے ہیں۔ انگور، انجیر، گلاب اور انار کی قلمیں کاٹ کر نمدار ریت میں دبا دیتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں کسان گندم، جَو اور السی کی فصلوں کو پانی دیتے ہیں۔ آلو کی فصل کی کھدائی کرتے ہیں اور مرچ کی فصل کے لیے زمین تیار کرنے لگتے ہیں۔ خیر یہ تو باہر کی بات ہے، گھروں کے اندر تو رونق ہی اور ہوتی ہے۔ حلوے بن رہے ہیں، طرح طرح کے میوے کھائے جا رہے ہیں۔ اِدھر کھانا کھایا اُدھر ہضم۔ میں آتا ہوں تو ہر شخص کا خون چُلّوؤں بڑھ جاتا ہے۔ بیمار سے بیمار آدمی کا

چہرہ بھی سیب کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے۔ اچھا فروری بھائی! اب تم اپنا حال کہو۔

فروری: میں اپنا حال کیا کہوں، میرا زیادہ تر حال تو جنوری جیسا ہی ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ جب میں آتا ہوں تو اپنے ساتھ بڑی تیز اور سرد ہوا لاتا ہوں۔ اس سے ان غریب لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے جن کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ سی سی کر رہے ہیں، بتیسی بج رہی ہے، ناک سُر سُر بہہ رہی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے منہ پر ہے ہی نہیں۔ اس مہینے میں ہی باغبان اور مالی بادام، خوبانی، ناشپاتی وغیرہ کے درخت لگاتے ہیں۔ فالسہ اور انار کی کاٹ چھانٹ کرتے ہیں اور انگور، انجیر، انار اور مِٹھّے کی قلمیں لگاتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں کسان فصلوں کو پانی دیتے ہیں۔ گنّے کی کاشت کے لیے زمین تیار کرتے ہیں اور بعض موٹے تنے کی قسم کا گنّا بونا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ گنّے کی پچھلی فصل کو بیلنے کا کام جو پہلے سے شروع ہوتا ہے جاری رکھتے ہیں، اسی سے گُڑ تیار ہوتا ہے، شکر تیار ہوتی ہے۔ گرم گرم گُڑ اور شکر کیا بچے اور کیا بوڑھے سب مزے سے کھاتے ہیں۔

جنوری: اب تمہاری باری ہے مارچ بھیا !

مارچ: میں آتا ہوں تو سردی کم ہونے لگتی ہے، برف پگھلنے لگتی ہے۔ درختوں میں نئے پتے نکلنے لگتے ہیں اور ٹنڈ منڈ جھاڑیاں سر سبز ہونے لگتی ہیں۔ لوگ آہستہ آہستہ اپنے گرم کپڑے اُتارنے لگتے ہیں۔ باغبان باغوں میں سیب اور آلوچے کے درخت لگاتے ہیں، بیر کا بیج بوتے ہیں اور کاغذی لیموں اور لیچی کی داب لگاتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں کسان مرچ کا بیج پنیری کے طور پر یا ویسے ہی بوتے ہیں۔ اور کدّو، خربوزہ، کریلا، تربوز وغیرہ بوئے جاتے ہیں۔ میرے آتے ہی جاڑا گلابی ہو جاتا ہے۔۔۔

پھُول: (ٹوک کر) گلابی جاڑے کیسے ہوتے ہیں؟

مارچ: گلابی جاڑے ایسے موسم کو کہتے ہیں جس میں سردی بھی ہو اور گرمی بھی۔ دھوپ میں آئیں تو گرمی لگے اور سائے میں جائیں تو سردی لگے، لیکن یہ موسم صرف میدانی علاقوں میں ہوتا ہے۔ تمہارے علاقے میں تو مارچ بھی کافی سرد ہوتا ہے۔۔۔ ہاں سردی کا زور ضرور کچھ کم ہو جاتا ہے۔ سمجھ گئیں؟

پھُول: ہاں! اب میں سمجھ گئی ہوں جناب ! آپ آگے کہیے۔

مارچ: بس اتنا ہی کافی ہے۔ اب تمہارے میزبان یعنی اپریل کی باری ہے۔

اپریل: میں اپنا حال کیا کہوں بھائیو۔ جو بات ظاہر ہو، بھلا اسے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا حال تو اس لڑکی نے دیکھ ہی لیا ہے۔ میرا خیال ہے، زیادہ بیان کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

پھُول: نہیں بھیّا! اپنا کچھ اور حال بیان کیجیے۔

اپریل: اچھا! اپنے مہمان کی خواہش کو پورا کرنا ہر میزبان کا فرض ہوتا ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ جب میں آتا ہوں تو اپنے ساتھ بہار کا موسم لاتا ہوں۔ میرے آتے ہی ہر طرف بہار ہی بہار نظر آنے لگتی ہے۔ درختوں پر پھول نکل آتے ہیں اور پگھلتی ہوئی برف کے نیچے سے چاندنی کے ننھے ننھے سفید پھول جھانکنے لگتے ہیں۔

پھُول: یہ تو جنگل کا حال ہوا، کچھ باغوں اور کھیتوں کی بھی سُنائیے۔

اپریل: لو سنو! اس مہینے میں باغبان جنگلی بیر کے درختوں کو پیوند کرتے ہیں۔ سیب، ناشپاتی، آڑو، بادام اور خوبانی کے درختوں کو پیوند لگاتے ہیں اور لوکاٹ کے بیج بوتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں کسان گندم کی کٹائی شروع کرتے ہیں۔ کپاس کے لیے زمین تیار کرتے ہیں۔ فروری اور مارچ میں بوئی ہوئی بیلوں والی فصلوں میں گوڑائی، نلائی اور آبپاشی کرتے ہیں، گھیا توری بوتے ہیں اور بینگن کی پنیری کھیت میں لگاتے ہیں۔ یہ تو خیر کھیتوں کی باتیں ہیں، اصل اور دیکھنے کے قابل نظّارہ تو یا اس جنگل میں ہوتا ہے یا کسی باغبان کے باغ میں۔ یہاں ایک نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں قسم کے پھُول کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ رنگ برنگے پھُوں جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خوبصورت پریاں رنگ برنگ کے لباس پہنے کھڑی ہیں۔ اب کہاں تک بیان کروں میں۔ اِتنا ہی کافی ہے۔

جنوری: مئی بھیّا! اب تم اپنا حال کہو۔

مئی: اپریل بھیّا جس موسم کو لے کر آتے ہیں وہ مئی میں بھی جاری رہتا ہے۔ لیکن سردی کم ہو جاتی ہے اور گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ میدانی علاقوں

میں وہ موسم آجاتا ہے جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے۔

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ
بہا ایڑی سے چوٹی تک پسینا

پھُول: خوب! بہت خوب! لیکن مئی بھیّا یہاں تو مئی کے مہینے میں کسی کو پسینا نہیں آتا، بلکہ اچھی خاصی ٹھنڈ ہوتی ہے۔

مئی: میں نے تو میدانی علاقوں کی بات کی تھی ورنہ یہاں تو مئی چھوڑ جون میں بھی کسی کو پسینا نہیں آتا۔ یہ علاقہ پہاڑی جو ہوا۔ خیر! اب میرا باقی حال سنو۔ میرے آتے ہی بازار میں قسم قسم کے پھل آ جاتے ہیں، کیلا، خربوزہ، ککڑی وغیرہ۔ باغبان اس مہینے میں اپنے باغوں پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ آڑو، آلوچہ، خوبانی اور ناشپاتی کے پھلوں کو ضرورت کے مطابق چھدرا کرتے ہیں۔ میدانی علاقوں کے باغبان اپنے باغوں کے درختوں کے تنوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے ان پر چُونے کی سفیدی کر دیتے ہیں۔ کسان گندم کی کٹائی ختم کر کے اس کی گہائی

شروع کر دیتے ہیں، کپاس کی بجائی اسی مہینے میں ہوتی ہے۔ میرے آتے ہی لوگ اپنے گرم کپڑے اتار پھینکتے ہیں اور بالکل ہلکا پھُلکا لباس پہننے لگتے ہیں۔ بس بھئی! مجھے جو کہنا تھا، کہہ چکا۔

جنوری: اچھّا! اب تم بھی اپنا تعارف کراؤ جون بھائی۔

جُون: (مُسکراتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ اپنا تعارف کرانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ جُون اور جُون کی گرمی کو کون نہیں جانتا۔ میرا خیال آتے ہی بڑے بڑوں کے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ پسینا بہ رہا ہے، بار بار پیاس لگتی ہے۔ لوگ پانی پر پانی پیے جاتے ہیں لیکن پیاس ہے کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ لُو چلتی ہے اور زمین آسمان توے کی طرح تپتے ہیں۔

پھُول: یہاں تو جُون میں کسی کا ایسا حال نہیں ہوتا! یہ آپ کہاں کا حال بیان کر رہے ہیں؟

جُون: میدانی علاقوں کا۔۔۔ وہاں کُچھ ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے موسم اچھا رہتا ہے۔ تبھی تو میدانی علاقوں کے امیر لوگ

گرمیوں میں پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔

پھُول: اور پہاڑی علاقوں کے لوگ سردیوں میں میدانی علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔

جُون: میں آتا ہوں تو اپنے ساتھ گرمی کے کئی پھل لاتا ہوں جیسے آلو بخارا، فالسے، شہتوت اور آم جسے لوگ پھلوں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آڑو ہوتے ہیں، تربوز ہوتے ہیں۔ باغبان اپنے باغوں میں آڑو، آلوچے، خوبانی وغیرہ کو پیوند کرتے ہیں۔ سیب اور ناشپاتی کے پھلوں کو چھدرا کرتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں کسان گندم کی کٹائی کرتے ہیں۔ دھان کی پنیری بوتے ہیں۔ پیاز کی فصل اُکھاڑ لیتے ہیں۔ پھُول گوبھی کی پود کھیتوں میں لگاتے ہیں۔ ٹاٹ کے لیے پنیری بوتے ہیں اور سردیوں میں بوئی جانے والی سبزیوں کے لیے زمین تیار کرتے ہیں۔

جنوری: جولائی بھّیا! اب تمھاری باری ہے۔

جولائی: میں آتا ہوں تو وہ موسم آتا ہے جسے برسات یا برکھارُت کہتے ہیں اور

برسات نہ ہو تو لوگ جئیں کیسے۔ مینہ چھم چھم برس رہا ہے۔ باغوں میں جھولے پڑے ہیں۔ عورتیں ہاتھوں میں مہندی رچائے، سرخ سُرخ جوڑے اور دھانی چوڑیاں پہنے جھول رہی ہیں۔ گیت گائے جا رہے ہیں۔ ایک طرف کڑاہی چڑھی ہے۔ دوسری طرف پکوان پک رہے ہیں۔

جنوری: بھئی، تم تو سب سے نمبر لے گئے شاعری میں۔

جولائی : ابھی کہاں بھیّا! ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھو۔ برسات آئی۔ بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہے ہیں۔ سننے والوں کا کلیجہ دہلا جاتا ہے۔ دھما دھم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یہ مکان بیٹھا، وہ پاکھا گرا۔ جو مکان گرنے سے بچ گیا اُس میں یہاں ٹپکا لگا، وہاں ٹپکا گرا۔ کبھی اِدھر کے بچھونے اُدھر بچھ رہے ہیں کبھی اُدھر کا پلنگ اِدھر آ رہا ہے۔ باہر نکالنا مشکل ہے۔ ذرا پاؤں باہر رکھّا اور چھینٹے سر سے اوپر گئے۔ سواری پاس سے نکل گئی تو کپڑے سب چھینٹم چھانٹ ہو گئے۔ ذرا تیز چلے اور جوتیاں کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔ اور پھر پھسلن ایسی کہ جو ایک بار پھسلے تو ساری عُمر گھر بیٹھ کر خدا کو یاد کرتا رہے۔

پھُول: خوب! بہت خوب! آپ نے برسات کا نقشہ خُوب کھینچا ہے۔ مُجھے یاد ہے ایک بار میری ماں نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی جس میں ایک بڑھیا کی ملاقات جاڑے، گرمی اور برسات سے ہوتی ہے۔ اس میں برسات نے بالکل ایسا ہی نقشہ کھینچا تھا جیسا آپ نے ابھی بیان کیا ہے۔

جولائی: اس مہینے میں پھلوں کے بادشاہ آم کی وہ بہتات ہوتی ہے کہ لوگ تمام پھلوں کو بھول جاتے ہیں۔ جسے دیکھو آم کھا رہا ہے۔ اس مہینے میں باغبان نئے پودے لگانے کے لیے گڑھے کھودتے ہیں اور ان میں کھاد اور مٹی وغیرہ ڈال کر انھیں پودے لگانے کے لیے تیار کرتے ہیں۔۔ میدانی علاقوں میں کسان چاول کی پِود کو کھیتوں میں لگاتے ہیں اور گنے اور کپاس وغیرہ کی فصلوں کو پانی دیتے ہیں۔۔۔۔ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ اس موسم میں لوگ باہر نکلتے ہیں تو عموماً چھتری وغیرہ ساتھ لے کر کیونکہ کوئی پتا نہیں ہوتا کہ کب بارش آجائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھر سے نکلے تو آسمان بالکل صاف لیکن تھوڑی دیر بعد ہی بادل گھِر آتے ہیں اور چھاجوں مینہ برسنے لگتا ہے۔ اس لیے جولائی کے مہینے میں تُم جب بھی باہر

نکلو، تو چھتری لانا نہ بھولنا۔

پھُول: آپ کی اس نصیحت کا بے حد شکریہ۔

جنوری: اچھّا اگست بھیّا! اب تم اپنا حال بیان کرو۔

اگست: میں اب اپنا حال کیا بیان کروں۔ جولائی بھائی نے برسات کا جو نقشہ کھینچ گئے ہیں، اسی میں میرا حال آجاتا ہے۔ کیونکہ ہم دونوں نے برسات کے مہینے ہیں اور اس برسات کا زور کبھی جولائی میں زیادہ ہوتا ہے اور کبھی اگست میں۔ ہاں جولائی بھیّا نے پہاڑوں کی برسات کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ اس کا نقشہ میں کھینچے دیتا ہوں۔ پہاڑی علاقوں کی برسات کا کیا ہی کہنا۔ یہاں تو بادل لوگوں سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کے گھر میں جا گھُسے اور گھر کی ایک ایک چیز کو تر کر گئے۔ کبھی کسی کے سامنے یا نیچے سے گزر گئے اور وہ دیکھتا کا دکھتا رہ گیا۔ گرمی کے مہینے ہیں تو میرے بھائی ہی لیکن وہ زمین کو جس بُری طرح جلا کر رکھ دیتے ہیں اس سے نجات برسات کی بدولت ہی ملتی ہے۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

جنوری: ستمبر بھائی اب تمہاری باری ہے۔

ستمبر: میں آتا ہوں تو برسات کے چل چلاؤ کا عالم ہوتا ہے اور خزاں کی آمد ہوتی ہے۔ اس مہینے میں انگور اور سردے جیسے مزیدار پھل بازار میں آ جاتے ہیں۔ باغبان اپنے باغوں میں آم کے پودوں کو پیوند لگاتے ہیں۔ کسان گندم وغیرہ کی بِجائی کے لیے زمین کو تیار کرتے ہیں۔ اس مہینے میں آلو کی فصل بوئی جاتی ہے۔ اروی ادرک اور شکر قندی کی فصلیں بھی اسی مہینے میں تیار ہوتی ہیں اور کسان ان کی کھدائی شروع کرتے ہیں۔ پالک، میتھی اور دھنیا اسی مہینے لگایا جاتا ہے۔ توریا، سرسوں اور چنے اسی ماہ بُوئے جاتے ہیں۔ تِل، جوار، باجرہ، مونگ، موٹھ اور ماش کی کٹائی بھی اسی مہینے شروع ہوتی ہے۔ خیر یہ تو باغوں اور کھیتوں کا حال ہے۔ اس مہینے سے ذرا ذرا سردی شروع ہو جاتی ہے۔ دِن کو اچھی خاصی گرمی ہوتی ہے اور رات کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ بس بھئی! اپنا حال تو ختم ہوا۔

جنوری: اکتوبر بھائی! اب تم اپنا تعارف کراؤ۔

اکتوبر: میں آتا ہوں تو خزاں آ جاتی ہے۔ درختوں کے پتے جھڑنے لگتے ہیں اور

جس درخت کو بھی دیکھو سوائے ٹنڈ منڈ شاخوں کے اور کُچھ نظر نہیں آتا۔ اسی مہینے میں میدانی علاقوں کے کسان گندم کی کاشت شروع کرتے ہیں۔ مکئی وغیرہ کی فصلوں کی کٹائی کرتے ہیں۔ جڑ والی سبزیوں مثلاً مولی، شلغم، گاجر، چقندر وغیرہ اور پالک، میتھی کی کاشت ہوتی ہے۔ اور مٹر کی کاشت بھی اسی مہینے میں کی جاتی ہے۔ غرض دیکھنے کو تو ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کاشت اور تخم ریزی کا جتنا کام اس مہینے میں ہوتا ہے، وہ اور کسی مہینے میں نہیں ہوتا۔

جنوری: اب تمہاری باری ہے نومبر بھیّا!

نومبر: میں بھی اپنا کُچھ حال بیان کرتا ہوں۔ یہ مہینا بھی ایک طرح سے خزاں کا مہینا ہے۔ اس مہینے میں سردی بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے لوگ گرم کپڑے پہننے لگتے ہیں۔ شلغم، مولی، پھول گوبھی اور بند گوبھی بازار میں آ جاتی ہے۔ پیاز، بینگن اور ٹماٹر کے بیج کی کاشت اسی مہینے کے شروع میں ہوتی ہے۔ اس مہینے کپاس کی چنائی بھی جاری رہتی ہے اور گندم کی بِجائی بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ

کہ اسی مہینے میں گنّے کی بیلائی شروع ہوتی ہے اور گنے کے رس سے وہ گرم گرم گڑ اور شکر تیار ہوتی ہے جس کا ذکر فروری بھیّا نے بڑے مزے لے لے کر کیا تھا۔ یاد ہے تمھیں!

پھُول: ہاں! مجھے یاد ہے۔

نومبر: رس، گڑ اور شکر بنانے کا کام میرے آنے سے ہی شروع ہوتا ہے اور میرا آنا گویا سردی کے آنے کا الارم ہے۔ لوگ میری آمد کے ساتھ ہی سردی کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگتے ہیں۔ نئے لحاف اور گدّے بنائے جاتے ہیں۔ پرانے اُدھیڑ کر ان میں دوبارہ روئی بھروائی جاتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پرانے لحاف میں سے سردی چُپکے سے گھُس آئے اور کسی کو ہوا لگ جائے۔ بس بھئی! اپنا حال تو ختم ہوا۔

جنوری: دسمبر بھیّا! اب تمہاری باری ہے

دسمبر: تم سب تو اپنا اپنا حال بیان کر چکے, ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ سال کا آخری اور بارہواں مہینا۔ لیکن سوچتا ہوں کہ اپنا حال کیا کہوں۔ جنوری بھائی نے اپنا جو

حال کہا ہے، اسی میں میرا حال بھی آجاتا ہے۔ میں ختم ہوتا ہوں تو ساتھ ہی سال ختم ہو جاتا ہے اور پھر نیا سال شروع ہو جاتا ہے۔ اس مہینے میں سردی کے مختلف پھل مثلاً مالٹا، سنگترہ وغیرہ بازار میں آجاتے ہیں اور لوگ انہیں خُوب مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ اس مہینے میں برف بھی پڑنے لگتی ہے اور کُہرا بھی۔ باغبان اپنے پودوں کو کُہرے سے بچانے کے لیے انہیں سرکنڈوں اور گھاس پھونس وغیرہ سے ڈھانپ کر رکھتے ہیں۔ چھوٹے سیب اور ناشپاتی کے بیجوں کو ذخیرے میں لگاتے ہیں۔ خُوبانی اور کے پودوں کی کاٹ چھانٹ کرتے ہیں اور بہار میں پودے لگانے کے لیے باغ کی زمین تیّار کرتے ہیں۔پھُولوں کے بادشاہ گلاب کی کانٹ چھانٹ بھی اسی مہینے کی جاتی ہے۔ باقی رس، گُڑ اور شکر کا قصّہ جو نومبر بھیّا نے بیان کیا ہے، وہ اس مہینے میں بھی جاری رہتا ہے۔

دسمبر اپنا حال کہہ کر خاموش ہو گیا تو جنوری نے پھُول سے کہا۔

جنوری: دیکھو بیٹی! ہم بارہ مہینوں نے تم سے اپنا تعارف کرا دیا ہے۔ کہو تم اب تو خُوش ہو؟

پھُول: میں اس کے لیے آپ کی شُکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے ایسی باتیں بتائی ہیں جو مجھے پہلے معلوم نہیں تھیں۔

جنوری: اور اب میں تمہیں ایک بہت ہی ضروری بات بتاتا ہوں۔ بیٹی! اس سال کے آخری دن تمہاری ملاقات اکٹھّے بارہ مہینوں سے ہوئی ہے۔ اگست ابھی بُہت دور ہے لیکن وہ یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اپریل کے چاندنی کے پھُول کھلنے میں ابھی تین مہینے باقی ہیں، لیکن تم اپنی ٹوکری ان پھولوں سے بھر چکی ہو۔ اسی طرح باقی مہینے ابھی بہت دور ہیں لیکن تم انہیں دیکھ چکی ہو۔ لوگ ہم تک ایک لمبا راستہ طے کر کے پہنچتے ہیں لیکن تم سب سے چھوٹے راستے سے ہم تک پہنچ گئی ہو۔ اس لیے یہ چھوٹا راستہ کسی شخص پر ظاہر نہ کرنا۔

فروری: اور کسی کو یہ بھی نہ بتانا کہ تمہیں یہ پھُول کس نے دیے ہیں۔

پھول: میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔

جنوری: اگر تم اپنے وعدے پر قائم رہو گی تو اگلے سال کے جشن میں ہم پھر تمہیں شریک کریں گے۔

پھُول : آپ کا بُہت بُہت شکریہ۔ میں اگلے سال ضرور آؤں گی۔ دسمبر : لیکن دیکھنا کہیں راستہ نہ بھُول جانا۔ وہ دیکھو وہ جو سامنے برگد کا بوڑھا درخت ہے اس کے پاس سے دو راستے نکلتے ہیں۔ دائیں طرف کو جو راستہ جاتا ہے، وہ ہماری طرف یعنی آنے والے دِنوں کی طرف نکلتا ہے اور جو راستہ بائیں طرف کو جاتا ہے وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔

پھُول: (حیران ہو کر) کہیں بھی نہیں جاتا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

دسمبر: اس راستے پر جو بھی جائے گا، زندہ نہیں بچے گا۔

اپریل: لیکن تمھیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ تمہارے پاس میری انگوٹی ہے۔ یہ انگوٹھی تمہاری ہر مشکل کو آسان کرے گی۔

جنوری: اب تم جلدی سے اپنے گھر پہنچو۔ ایک گھنٹا ختم ہونے ہی والا ہے۔ اس کے بعد میں پھر برف کے طوفان کو کھُلا چھوڑ دوں گا۔

پھُول: اچھّا خدا حافظ۔

تمام مہینے: (ایک ساتھ) خُدا حافظ !

اور اس کے بعد پھُول نے پھُولوں سے بھَری ہوی ٹوکری سنبھالی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی گھر کی طرف چل دی۔ اب اس کے دل میں کسی قسم کا ڈر نہیں تھا۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔۔۔۔!

انگوٹھی

صُبح ہو چکی تھی۔ رانی اور موتی محل میں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے فرش پر چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی وہ ٹوکری پڑی تھی جو پھول جنگل سے لائی تھی۔

موتی: میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا امّاں کہ پھُول کو سب سے بڑی ٹوکری دو۔ اب یہ غلطی تمہاری ہے۔ بھلا اس ٹوکری میں کتنی اشرفیاں آسکتی ہیں؟

رانی: لیکن یہ کسے خیال آسکتا تھا کہ پھول زندہ واپس آجائے گی۔ مجھے تو اس بات پر حیرانی ہے کہ وہ یہ پھُول لے کہاں سے آئی ہے؟

موتی: تم نے ان سے پوچھا نہیں امّاں؟ رانی: نہیں بیٹی! وہ جب پھُول لے کر آئی تو بُہت خوش تھی۔ جیسے کسی جنگل سے نہیں کِسی جشن یا میلے سے آرہی ہو۔ آتے ہی اس نے ٹوکری ایک طرف رکھی اور کچھ کھایا نہ کچھ پیا، سیدھی اپنے بستر میں جا گھُسی۔ میں پھُولوں کو دیکھنے لگی اور تھوڑی دیر بعد جا کر اسے دیکھا تو وہ گہری

نیند سو رہی تھی اور ابھی تک سو رہی ہے۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں جاگی، ہار کر مجھے خود جھاڑو دینا پڑی، خود برتن مانجھنے پڑے اور خُود چولہا جلانا پڑا۔

موتی: میں اسے جا کر جگاتی ہوں۔ تم اتنے میں یہ پھول اس ٹوکری سے نکال کر بڑی ٹوکری میں سجادو۔

رانی: وہ ٹوکری خالی خالی نظر نہیں آئے گی۔

موتی: پھولوں کو ذرا پھیلا کر رکھ دینا یہ کون سی مشکل بات ہے۔

یہ کہہ کر موتی اسی کمرے میں چلی گئی جہاں پھُول سو رہی تھی۔ رانی نے پھُول چھوٹی ٹوکری سے نکال کر بڑی ٹوکری میں رکھّے اور جب وہ ٹوکری خالی نظر آئی تو وہ سوچنے لگی کہ کیا ترکیب کروں۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ پھُولوں کے نیچے مٹّی کی تہہ جمادی جائے۔

اس نے صحن کے ایک کونے میں سے کُچھ مٹّی کھودی اور اسے ٹوکری کی تہہ میں

جما دیا اس کے بعد اس نے صحن میں لگے ہوئے درخت سے کُچھ پتّے توڑے اور ان پتوں سے پھولوں کے ارد گرد ایک سبز حاشیہ سا بنا دیا۔ پھر دیکھ دیکھ کر خود ہی خوش ہونے لگی کہ میں نے کتنی صفائی اور خوبصورتی سے ٹوکری کو بھر دیا ہے۔

اتنے میں موتی اندر آئی۔

رانی: دیکھو بیٹی! میں نے پھُولوں کو کِس طرح سجایا ہے۔

موتی: (آہستہ سے) بہُت خوب! اور یہ بھی دیکھو۔

رانی: ارے! انگوٹھی! یہ کہاں سے ملی تمہیں۔

موتی: یہ پھُول کی انگلی میں تھی۔ میں نے چُپکے سے اُتار لی۔ وہ تو گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے۔

رانی: اچھا! میرا پہلے ہی یہ خیال تھا۔ موتی: کیا خیال امّاں؟

رانی: یہ پھول اس نے نہیں توڑے۔ کسی نے اس کی مدد کی ہے اور یہ انگوٹھی بھی شاید اسی نے دی ہے۔ ذرا دیکھا تو مجھے۔

رانی نے انگوٹھی موتی سے لے کر دیکھی اور حیران رہ گئی۔

رانی: ایسی چمکدار انگوٹھی تو میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ بہت قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ تم اُسے اپنی انگلی میں پہن لو۔

موتی نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہننے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے تنگ تھی۔

موتی: یہ انگوٹھی تنگ ہے کسی بھی انگلی میں نہیں آتی۔

اتنے میں پھُول آنکھیں ملتی ہوئی اندر آئی۔ اُسے دیکھ کر موتی نے جلدی سے انگوٹھی کو اپنی جیب میں ڈال لیا۔پھُول نے پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ٹوکری میں پڑے ہوئے پھولوں کو اُلٹ پلٹ کرے لگی۔

رانی: کیا ہو گیا ہے تمہیں! میں نے اتنی محنت سے سجایا ہے ان کو۔۔۔ تم ناس کیوں رہی ہو۔

پھُول: خالہ! میں جس ٹوکری میں پھُول لائی تھی وہ کہاں ہے؟

رانی: وُہ پڑی ہے کھڑکی میں۔

پھُول نے کھڑکی میں رکھی ہوی ٹوکری کو اٹھالیا اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

موتی: تم کیا ڈھونڈ رہی ہو پھُول؟

رانی: اسے چیزیں ڈھونڈنے کی پرانی عادت ہے۔ اگر یہ عادت نہ ہوتی تو اسے اس موسم میں چاندنی کے پھُول کیسے مل جاتے۔

موتی: اور کل یہ جھگڑا کر رہی تھی کہ سردیوں میں چاندنی کے پھول نہیں ہوتے۔ آخر اب یہ تمھیں کہاں سے مل گئے؟

پھُول: جنگل میں سے۔

اور یہ کہہ کر وہ فرش کو دیکھنے لگی۔ اس پر رانی نے چڑ کر کہا۔

رانی: کیا ڈھونڈ رہی ہو تم؟ بتاتی کیوں نہیں ہو؟

پھُول: تم نے کوئی گری پڑی چیز اٹھائی ہے خالہ؟

رانی: ہم کیوں اُٹھاتے! ہم کوئی ندیدے ہیں۔

موتی: معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری اپنی کوئی چیز کھو گئی ہے لیکن تم بتانا نہیں چاہتیں۔

رانی: اگر تم بتادو کہ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے تو شاید ہم تمہاری کچھ مدد کر سکیں۔

پھول: (جھجکتے ہوئے) میری انگوٹھی گم ہو گئی ہے۔

رانی: لیکن تمہارے پاس تو کوئی انگوٹھی تھی ہی نہیں۔

پھول: یہ انگوٹھی کل شام مجھے جنگل میں سے ملی تھی۔

رانی: بڑی قسمت والی ہو تم۔ پہلے تمہیں چاندنی کے اتنے ڈھیر سارے پھول مل گئے۔ پھر انگوٹھی مل گئی۔ خیر تم انگوٹھی ڈھونڈو ہم تو محل جا رہے ہیں۔

پھول: تم میری انگوٹھی کا کیا کرو گی خالہ! مجھے واپس دے دو خُدا کے لیے۔ رانی: عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔ ہمیں کیا پتا تمہاری انگوٹھی کہاں ہے۔

موتی: ہم نے تو اس کی شکل تک نہیں دیکھتی۔

پھُول: موتی! میری انگوٹھی تمہارے پاس ہے۔ مذاق نہ کرو اور انگوٹھی مجھے دے دو۔ تم محل میں چاندنی کے پھولوں کی ٹوکری لے کر جا رہی ہو۔ وہاں تمہیں ان کے بدلے ٹوکری بھر اشرفیاں مل جائیں گی۔ ان سے تم جو چاہو گی، خرید سکو

گی۔ لیکن میرے پاس تو اس انگوٹھی کے سوا کبھی نہیں۔

رانی: (جھڑکتے ہوئے) کیوں جھاڑ کی طرح لپٹی جا رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگوٹھی تمہیں پڑی نہیں ملی بلکہ کسی نے تحفے میں دی تھی۔

موتی: بتاؤ، کس نے تمہیں انگوٹھی دی تھی۔

پھُول: کسی نے بھی نہیں۔ میں نے تو جنگل میں پڑی پائی تھی۔

رانی: تو پھر کیوں یوں ہلکان ہو رہی ہو۔ انگوٹھی جیسے آئی تھی، ویسے ہی چلی گئی۔

پھر وہ موتی سے بولی۔

رانی: جلدی کرو موتی۔ یہ ٹوکری اُٹھالو۔ محل میں ہمارا انتظار ہو رہا ہو گا۔

یہ کہہ کر دونوں ماں بیٹی دروازے کی طرف بڑھیں۔ پھُول نے انہیں بہتیری آوازیں دیں لیکن وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

پھُول سوچنے لگی کہ اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ خالہ اور موتی تو میری بات بھی سُننا نہیں چاہتیں۔ بارہ مہینے دُور ہیں اور انگوٹھی کے بغیر میں انہیں تلاش بھی

نہیں کر سکتی۔ اب کون میری مدد کرے گا؟

اس نے سوچا کہ کیوں میں ملکہ کے اس جا کر فریاد کروں؟ آخر میں ہی تو اس کے لیے اتنے ڈھیر سارے چاندنی کے پھُول لائی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ پر ترس کھائے اور اس طرح میری انگوٹھی مُجھے واپس مِل جائے۔

لیکن پھر اس نے سوچا کہ چاندنی کے پھولوں کے بغیر تو مجھے محل میں کوئی بھی نہیں جانے دے گا اور چاندنی کے پھولوں کی ٹوکری خالہ اور موتی لے کر چلی گئی ہیں۔ میری بات کون مانے گا کہ یہ بھول میں ہی توڑ کر لائی ہوں۔۔۔۔

یہ سوچتی ہوئی وہ چولھے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے دو تین لکڑیاں چولھے میں ڈالیں تو آگ تیز ہو گئی۔۔۔۔۔ اس پر اسے بارہ مہینوں کا گیت یاد آگیا۔

اے آگ تیز اور تیز جل

شعلہ تیرا اونچا رہے

اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

نئے سال کا جشن

محل میں شاہی تخت کے سامنے کا دروازہ اُن خوبصورت اور ہری بھری شاخوں سے سجا ہوا تھا جو بوڑھا سپاہی جنگل سے کاٹ کر لایا تھا۔ اس دروازے کو رنگ برنگی روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔

جگمگ جگمگ کرتے قیمتی لباس پہنے ہوئے مہمان ملکہ چندا کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ان مہمانوں میں وزیروں اور امیروں کے علاوہ غیر ملکی سفیر بھی تھے۔ وہ سب اپنے اپنے بادشاہوں کی طرف سے ملکہ چندا کے لیے مبارک باد کا پیغام لے کر آئے تھے۔

شانی بگلچی نے بگل بجا کر ملکہ چندا کی آمد کا اعلان کیا تو سب مہمان ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ دروازہ کھُلا اور ملکہ چندا بڑی شان سے اندر داخل ہوئی۔ ملکہ کے دائیں ہاتھ وزیر اعظم اور بائیں ہاتھ فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ پیچھے چند خادمائیں تھیں جو ملکہ کے بھاری اور بیش قیمت لباس کے پچھلے حصّے کو تھامے

ہوئے ے تھیں تا کہ وہ زمین پر نہ لگنے پائے۔ اور ان سب کے پیچھے ماسٹر صاحب سر جھکائے ہوئے آرہے تھے۔

ملکہ کے آتے ہی تمام مہمانوں نے ایک ساتھ مبارک باد دی۔

سب مہمان: نیا سال مبارک ہو ملکہ عالیہ! نیا سال مبارک۔

ملکہ: شکریہ ! ہر نیا سال ہمارے لیے مبارک ہی ہوا کرتا ہے لیکن ابھی تو نیا سال آیا ہی نہیں۔

مہمانوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ ملکہ نے جان بوجھ کر یہ بات کہی ہے لیکن کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ملکہ کو یہ یاد نہیں رہا کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ وزیر اعظم کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے جھک کر سلام عرض کیا پھر کہا۔

وزیر اعظم: اجازت ہو تو میں عرض کروں ملکہ عالیہ کہ آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے۔

ملکہ: تم غلطی پر ہو۔

یہ کہہ کر اس نے ماسٹر صاحب کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

ملکہ: دسمبر کے کتنے دن ہوتے ہیں ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب: ٹھیک اکتیس دن حضور!

ملکہ: تو پھر آج دسمبر کی بتیس تاریخ ہے۔

یہ سن کر مہمان ہنس پڑے لیکن ملکہ نے ان کو ڈانٹ دیا۔

ملکہ: کیوں ہنس رہے ہیں آپ لوگ؟ میں نے کوئی مذاق تو نہیں کیا ہے۔ آج دسمبر کی بتیس تاریخ ہے۔ کل تینتیس ہو گی اور پرسوں چونتیس۔ اس سے آگے کیا آتا ہے ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب: (جلدی سے) دسمبر کی پینتیس، دسمبر کی چھتیس، دسمبر کی سینتیس۔ لیکن یہ ناممکن ہے ملکہ حضور!

ملکہ: آپ پھر وہی باتیں کرنے لگے ماسٹر صاحب! ماسٹر صاحب: ہاں ملکہ حضور!

آپ میرا سر قلم کرا سکتی ہیں۔ مجھے جیل میں ڈال سکتی ہیں لیکن دسمبر کی سینتیس تاریخ کبھی نہیں ہوتی۔ دسمبر کے اکتیس دن ہوتے ہیں۔ صرف اکتیس۔

ملکہ: خیر کوئی بات نہیں، میں نے سنا ہے کہ کبھی کبھی بادشاہ بھی سچّی بات سُننا پسند کرتے ہیں۔ پھر بھی جب تک یہاں چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری نہیں آئے گی، دسمبر ختم نہیں ہو گا۔

ماسٹر صاحب: جیسے آپ کی مرضی ملکہ حضور! لیکن چاندنی کے پھُول یہاں آنے سے رہے۔

ملکہ: ہم دیکھیں گے۔

یہ کہ کر ملکہ تخت پر بیٹھ گئی اور اشارے سے وزیرِ اعظم کو بلایا۔

ملکہ: کیا بات ہے جو ابھی تک پھول نہیں آئے؟ آپ نے میرا حکم ہر شخص تک پہنچا دیا تھا؟

وزیر اعظم: آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے ملکۂ عالیہ! پھُول ابھی آپ کے

قدموں میں ڈھیر کر دیے جائیں گے۔

وزیر اعظم نے جیب سے رومال نکال کر ہلایا۔ دروازہ کھلا اور کوئی ایک درجن مالیوں کا جلوس پھُولوں کی ٹوکریاں، گلدستے، ہار اور گجرے لیے اندر داخل ہوا۔ شاہی مالی نے گلاب کے سُرخ سُرخ پھُولوں سے بھری ہوئی ایک بڑی سی ٹوکری ملکہ کی خدمت میں پیش کی۔ دوسرے مالیوں نے بھی لالہ، نرگس، یاسمن، داؤدی، نسرین اور دوسرے بُہت سے پھُول ملکہ کے تخت کے گرد سجادیے۔

رنگا رنگ پھُولوں کو دیکھ کر درباری بے ساختہ واہ واہ! پکار اُٹھے۔ ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ان کی تعریف کرنے لگا۔ لیکن ملکہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے وزیر اعظم سے پوچھا۔

ملکہ: ان پھُولوں میں چاندی کے پھول بھی ہیں؟

وزیر اعظم: ضرور ہوں گے ملکۂ عالیہ!

ملکہ: مجھے دکھاؤ۔ وزیر اعظم نے جھک کر پھولوں کو دیکھنا شروع کیا اور پھر یاسمن

اور سفید گلاب کے پھول اُٹھا کر ملکہ کی خدمت میں پیش کر دیے۔۔

وزیر اعظم: میرا خیال ہے ان میں سے ایک ضرور چاندنی کا پھُول ہے۔

ملکہ: کون سا؟

وزیر اعظم: جو آپ کو زیادہ پسند ہو ملکہ عالیہ !

ملکہ: کیا واہیات بات ہے (ماسٹر صاحب سے) آپ کا کیا خیال ہے ماسٹر صاحب؟
ان میں چاندنی کا پھُول کون سا ہے؟

ماسٹر صاحب: جہاں تک میرا خیال ہے حضور! ان دونوں میں سے کوئی بھی
چاندنی کا پھُول نہیں۔

ملکہ: (شاہی مالی سے) تم بتاؤ۔ یہ کون کون سے پھُول ہیں؟

مالی: یہ سفید گلاب ہے حضور! اور یہ یاسمن ہے جسے موتیا بھی کہتے ہیں۔

ملکہ: (غصّے سے) مجھے موتیا وتیا نہیں چاہیے۔ میں چاندنی کے پھُول چاہتی ہوں۔
جو پھُول تم لے کے آئے ہو ان میں چاندنی کے پھول ہیں یا نہیں یہ بتاؤ مجھے؟

مالی: حضور! شاہی باغات میں چاندنی کا پھُول نہیں پیدا ہوتا۔

ملکہ: تو پھر کہاں پیدا ہوتا ہے؟

مالی: جنگل میں حضور! جو اس کی اصلی جگہ ہے۔

ملکہ: تو جاؤ جنگل سے لے کے آؤ۔

مالی: میں معافی چاہتا ہوں حضور! چاندنی کا یہ موسم نہیں ہے۔ یہ پھُول تو کہیں اپریل میں جا کر کھلتے ہیں۔

ملکہ: (غصّے میں آ کر) یہ کیسی سازش ہے۔ ہر شخص اپریل اپریل کی رٹ لگا رہا ہے۔ میں یہ نام سننا نہیں چاہتی۔ اگر آج چاندنی کے پھُول نہیں آئے تو میں تم سب کی گردن مار دوں گی۔

اتنے میں ایک دربان ہانپتا کانپتا آیا اور ملکہ کے سامنے جھُک کر آداب بجالاتے ہوئے بولا۔

دربان: حضور! چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری محل میں آ گئی

ہے۔

وزیر اعظم: (حیران ہو کر) کون لایا ہے؟ دربان: دو عورتیں لے کر آئی ہیں۔

ملکہ: ان دونوں کو یہاں لے آؤ۔

دربان واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی رانی اور موتی اندر داخل ہوئیں۔ پھولوں کی ٹوکری موتی نے اٹھا رکھی تھی۔

موتی کے ہاتھ میں ٹوکری دیکھتے ہی ملکہ جھٹ تخت سے اتری اور ٹوکری موتی سے لے لی۔ پھر جلدی سے ٹوکری پر پڑا ہوا رومال اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور کہنے لگی۔

ملکہ: تو یہ چاندنی کے پھول ہیں؟

رانی: جی حضور! ہم اپنے ہاتھوں سے برف کے نیچے سے نکال کر لائے ہیں حضور!

ملکہ: (پھول اٹھا کر دیکھتے ہوئے) ہاں! یہی چاندنی کے پھول ہیں۔ آج تمام مہمان اپنے لباس میں یہی پھول لگائیں۔۔۔ آج میں کسی اور پھول کی شکل بھی نہیں

دیکھنا چاہتی۔۔۔اُٹھالو یہ گلاب اور چنبیلیاں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

شاہی مالی آگے بڑھا، اور اس نے مالیوں کو اشارہ کیا۔ مالیوں نے پھولوں کی ٹوکریاں، گلدستے ہار اور گجرے اُٹھائے اور جلدی سے باہر نکل گئے۔اس کے بعد ملکہ مہمانوں میں گلِ چاندنی کے پھُول تقسیم کرنے لگی۔

ملکہ:(وزیر اعظم کو پھول دیتے ہوئے)لو یہ تمہارے لیے ہے۔

وزیر اعظم: آپ کا بہت بہت شکریہ ملکہٗ عالیہ !میں اس پھول کو سونے کے گلدستے میں رکھوں گا۔

ملکہ: ماسٹر صاحب !یہ پھول آپ کے لیے ہے۔ اگرچہ آپ کہتے ہیں کہ چاندنی کا پھول سردیوں میں نہیں کھلتا۔

ماسٹر صاحب : (پھُول کو غور سے دیکھتے ہوئے) واقعی سردیوں میں نہیں کھلتا حضور!میری عقل حیران ہے۔اس موسم میں یہ کہاں سے آگیا۔

ملکہ: ماسٹر صاحب! اگر آپ سکول کے طالب علم ہوتے تو میں آپ کو کونے میں

کھڑا کر دیتی۔ چاندنی کا پھُول دیکھ رہے ہیں اور پھر بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔

ماسٹر صاحب خاموش رہے۔ ملکہ چند امہمانوں کو ایک ایک پھول دیتی گئی۔ جب تمام مہمانوں میں چاندنی کے پھُول تقسیم ہو چکے تو ملکہ نے ٹوکری جس میں کچھ پھول ابھی باقی تھے، وزیر اعظم کو دے دی اور خود تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔

ملکہ: آپ سب لوگوں کو چاندنی کا پھُول مل چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری ریاست میں نیا سال شروع ہو گیا ہے۔ اب تم لوگ اپنی مبارک باد پیش کر سکتے ہو۔

تمام مہمان: نیا سال مبارک ہو ملکۂ عالیہ! نیا سال مبارک ہو۔

ملکہ: نیا سال مبارک، نیا سال مبارک۔

کچھ دیر تک ہر طرف مبارک سلامت کا شور ہوتا رہا اور جب یہ شور تھما تو رانی اور موتی ملکہ کے سامنے آئیں اور جھُک کر آداب بجالائیں۔

رانی: ہماری طرف سے بھی نئے سال کی مبارک باد قبول فرمائے حضور!

ملکہ: (چونک کر) ارے! تم ابھی تک یہیں ہو؟

رانی: ہاں حضور! ہم اپنے انعام کا انتظار کر رہے ہیں۔ ملکہ: ارے ہاں تمھیں ابھی انعام مل جاتا ہے۔ وزیر اعظم! ان کی ٹوکری اشرفیوں سے بھر دی جائے۔

وزیرِ اعظم: لبالب بھر دی جائے ملکۂ عالیہ؟

رانی: آپ کا وعدہ یہی تھا حضور! ٹوکری بھر پھول اور ٹوکری بھر اشرفیاں۔

وزیر اعظم: لیکن ملکہ عالیہ! ان کی ٹوکری میں تو پھولوں سے زیادہ مٹّی تھی۔

ملکہ: انھیں پھولوں کے برابر اشرفیاں دے دی جائیں۔

وزیر اعظم نے ٹوکری اٹھالی اور اندر چلا گیا۔

ملکہ: دیکھا! اگرچہ اپریل ابھی نہیں آیا ہے لیکن چاندنی کے پھُول کھل گئے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب: میں اب بھی اِسے غلط خیال کرتا ہوں حضور!

ملکہ: کیا کہا، غلط؟

ماسٹر صاحب: جی ہاں حضور! یہ انہونی بات ہے۔ آپ ان عورتوں سے دریافت فرمائیں کہ انہیں چاندنی کے پھول کہاں سے ملے؟

ملکہ: (رانی اور موتی سے) بتاؤ یہ پھُول تمہیں کہاں سے ملے؟

رانی اور موتی خاموش رہیں تو ملکہ نے انہیں ڈانٹا۔

ملکہ: خاموش کیوں ہو؟ بتاؤ تمہیں یہ پھُول کہاں سے ملے؟

رانی: (موتی سے) تم بتاؤ۔

موتی: تم خود ہی بتاؤ نا۔

رانی آگے بڑھی اور گلا صاف کر کے بولی۔

رانی: ہم نے شاہی اعلان سُنا تو فیصلہ کیا چاہے اس کوشش میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے، اپنی ملکہ کی خواہش کو ضرور پورا کریں گے۔ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور سردی بڑھ رہی تھی لیکن ہم نے کوئی پروا نہیں کی۔ پھاوڑا لیا اور خُدا کا نام

لے کر چل پڑے، پھاوڑے سے ہم نے اپنا راستہ بنایا اور برف کو کھودا۔ سردی کے مارے ہمارا خون جما جا رہا تھا لیکن ہم جنگل میں بڑھتے چلے گئے۔ میری بیٹی سردی سے کانپ رہی تھی میں نے سوچا کہ بس اب کوئی دم میں ہمیں موت آ جائے گی۔۔۔۔

ملکہ: (ٹوکتے ہوئے) پھر کیا ہوا؟

رانی: پھر حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ برف کے تودے اور بھی بلند ہوتے گئے۔ سردی بڑھتی گئی اور جنگل میں اندھیرا ہوتا گیا۔ ہمیں کئی بار پیٹ اور کہنیوں کے بل رینگنا پڑا۔

ملکہ: (حیرانی سے) پیٹ اور کہنیوں کے بل رینگنا پڑا! پھر کیا ہوا؟

رانی: ہم اسی طرح پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور آخر کار ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ جھیل کا پانی ابھی تک جما نہیں تھا اور اس کے کناروں پر بے شمار پھول اُگے ہوئے تھے۔

ملکہ: چاندنی کے پھُول؟

رانی: صرف چاندنی ہی کے نہیں، ہر قسم اور رنگ کے پھول۔ بعض پھُول تو ایسے تھے جنہیں ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ملکہ: (خوشی سے) اچھّا! تو ابھی جاؤ اور چاندنی کے پھولوں کی ایک اور ٹوکری بھر لاؤ۔

رانی: حضور!

ملکہ: کیا بات ہے؟ تم جانا نہیں چاہتیں؟

رانی: بہت لمبا اور دشوار سفر ہے حضور!

ملکہ: اتنا لمبا تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے کل شام ہی اعلان کرایا تھا اور آج تم پھُول لے آئی ہو۔

رانی: لیکن ہم تو سردی سے آدھ موئے ہو گئے تھے حضور!

ملکہ: کوئی بات نہیں۔ ہم تمہیں گرم چغے دے دیں گے۔ انہیں پہن کر تمہیں

سردی نہیں لگے گی۔



یہ کہہ کر ملکہ نے ایک خادم کو دو چغے لانے کا حکم دیا۔

رانی:(موتی کے کان میں) اب کیا کریں؟

موتی:(آہستہ سے) ہم پھُول کو بھیج دیں گے۔

رانی: اُسے اور پھول مل جائیں گئے؟

موتی: ضرور مل جائیں گے۔

ملکہ: یہ تم کیا کانا پھوسی کر رہی ہو؟

رانی: ہم جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ حضور کام بہت سخت ہے پھر بھی ہم آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے پوری پوری کوشش کریں گے۔ آپ ہمیں گرم چغے منگوا دیں۔ ہم ابھی روانہ ہو جائیں گے۔

یہ کہہ کر رانی جھک کر اشرفیوں سے بھری ہوئی وہ ٹوکری اٹھانے لگی جو وزیر اعظم نے لا کر سامنے رکھ دی تھی۔

ملکہ: تمہیں چغے مل جائیں گے۔ یہ ٹوکری ابھی یہیں پڑی رہنے دو۔ جب تم

چاندنی کے پھولوں کی دوسری ٹوکری لے آؤ گی تو تمہیں اشرفیوں کی دو ٹوکریاں مل جائیں گی۔ دیر نہ کرنا۔ جلدی آنا۔

رانی نے ٹوکری پھر فرش پر رکھ دی۔ اتنے میں خادم چغے لے کر آ گیا۔

رانی: آپ کا بہت بہت شکریہ حضور! یہ کافی گرم ہیں۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔

رانی اور موتی نے جھک کر ملکہ کو سلام کیا اور باہر کی طرف چلیں۔ مگر چند قدم ہی گئی تھیں کہ ملکہ نے انہیں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

ملکہ: میرا خیال ہے کہ ہم سب اس خوبصورت جھیل پر چلیں اور اپنے ہاتھوں سے چاندنی کے پھول توڑیں۔ وزیر اعظم: بُہت خُوب بُہت خُوب!

ملکہ: بگھیوں میں گھوڑے جوت دیے جائیں اور ان عورتوں کو سب سے پہلی بگھی میں بٹھایا جائے تاکہ یہ ہمیں راستہ دکھاتی جائیں۔

موتی: (آہستہ سے) ہائے! ہم مارے گئے۔

رانی آہستہ سے آگے بڑھی اور بولی۔

رانی: آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔

ملکہ: کیوں؟

رانی: راستے میں جگہ جگہ برف پڑی ہوئی ہے۔ بہت مشکل راستہ ہے۔

ملکہ: ہم ابھی کمانڈر انچیف کو حکم دیتے ہیں کہ وہ سپاہیوں کے ایک دستے کو بیلچے اور پھاوڑے دے کر جنگل کی طرف روانہ کر دے۔

یہ کہہ کر ملکہ تخت سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی۔ رانی نے پھر اسے روکنے کی کوشش کی۔

رانی: حضور! میری مانیے۔ وہاں نہ جائیے۔

ملکہ: (غصّے سے) خاموش رہو، میں اب تمہاری زبان سے ایک لفظ سننا نہیں چاہتی۔ جھیل پر پہنچنے تک تمہیں بالکل خاموش رہنا ہو گا۔ راستہ بتانے کے لیے تم اپنے ہاتھوں سے کام لے سکتی ہو۔

رانی: لیکن کون سا راستہ حضور! جھیل تو اب غائب ہو چکی ہے۔

ملکہ:(سختی سے) تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟

رانی:(کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتی حضور!

وزیر اعظم: ملکۂ عالیہ! ان مکّار عورتوں کو قید میں ڈال دینا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اشرفیاں بٹورنے کے لیے ڈھونگ رچا رہی ہیں۔

ماسٹر صاحب: میرا بھی یہی خیال ہے حضور! بھلا بہار کے پھُول کہیں سردیوں میں کھلتے ہیں۔

ملکہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر واپس تخت پر آ کر بیٹھ گئی اور رانی اور موتی سے کہنے لگی۔

ملکہ: دیکھو اگر تم صاف صاف نہیں بتاؤ گی کہ تمہیں یہ پھُول کہاں سے ملے ہیں تو میں تمہارا سر قلم کرا دوں گی۔

رانی اور موتی نے جو دیکھا کہ معاملہ بگڑ گیا ہے اور اب انہیں سچ سچ بات بتانی ہی پڑے گی تو وہ دونوں ملکہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں اور رانی بولی۔

رانی: ہم نے تو یہ پھول نہیں توڑے ملکہ حضور!

ملکہ: (حیرانی سے) تم نے خود نہیں توڑے! پھر کس نے توڑے تھے؟

رانی: میری بھانجی پھُول نے۔ وہی جنگل میں گئی تھی۔

ملکہ: اچھّا! تو جنگل میں تمہاری بھانجی گئی اور محل میں پھُول لے کر تم آئیں۔ تم اُسے اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئیں؟

رانی: گھر کی دیکھ بھال کے لیے اس کا وہاں رہنا ضروری تھا۔

ملکہ: گھر کی دیکھ بال تم بھی تو کر سکتی تھیں۔

رانی: اصل میں بات یہ ہے حضور کہ وہ بہت شرمیلی ہے اور۔۔۔۔

ملکہ: وہ ہمیں چاندنی کے پھولوں کی جگہ تک پہنچنے کا راستہ تو دکھا سکتی ہے۔ رانی: ضرور دکھا دے گی! وہ ایک بار وہاں گئی ہے تو دوسری بار بھی جا سکتی ہے۔

ملکہ: ٹھیک ہے۔ تم دونوں گھر جاؤ اور اس لڑکی کو لے کر آؤ۔ ہم محل کے باہر بگھّی میں تمہارا انتظار کریں گے۔

رانی: ہم آدھ گھنٹے کے اندر اندر اُسے لے کر حاضر ہو جائیں گے۔

آدھے گھنٹے میں؟ (ماسٹر صاحب سے) ماسٹر صاحب! آدھے گھنٹے میں کتنے منٹ ہوتے ہیں بھلا؟

ماسٹر صاحب: گھنٹے میں ساٹھ منٹ حضور! اور آدھے گھنٹے میں اس سے آدھے منٹ ہوں گے۔

ملکہ: آپ مجھے حساب کا سبق نہیں پڑھا رہے ہیں کہ میں جمع، تفریق اور ضرب، تقسیم کرنے بیٹھ جاؤں۔ یہ نئے سال کا شاہی جشن ہے۔ جلدی بتایئے آدھے گھنٹے میں کتنے منٹ ہوتے ہیں؟

ماسٹر صاحب: تیس!

ملکہ: اور کتنے سیکنڈ؟

ماسٹر صاحب: ایک ہزار آٹھ سو۔

ملکہ: اوہ! ایک ہزار آٹھ سو۔ میں جانتی ہوں کم عدد جتنا بڑا ہو آپ کو اتنی ہی زیادہ

خوشی ہوتی ہے۔ خیر میں ایک ہزار سیکنڈ تک انتظار کروں گی۔ آپ اس کونے میں کھڑے ہو کر سیکنڈ گنیے اور جب ایک ہزار سیکنڈ پورے ہو جائیں تو مجھے بتا دیجیے۔

ماسٹر صاحب جیب سے گھڑی نکال کر سیکنڈر گننے لگے اور رانی اور موتی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی پھُول کو لینے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ایک ٹوکری اور چاہیے

رانی اور موتی گھر پہنچیں تو پھُول ابھی تک چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

رانی: بیٹی! میری پیاری بیٹی!

موتی: باجی! میری اچھی باجی!

پھول نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے لہجے پر بڑی حیران ہوئی اور کہنے لگی۔

پھُول: یہ تم کسے بُلا رہی ہو خالہ؟

رانی: تمہیں ہی تو بلا رہی ہوں بیٹی! میں اپنی پیاری پھُول کو بلا رہی ہوں۔

پھُول: (حیران ہو کر) کیا واقعی خالہ! لیکن پہلے تو تم نے کبھی مجھے اس طرح نہیں بلایا۔ کیا تمہیں اشرفیاں مِل گئی ہیں؟

رانی: نہیں۔

پھُول: کیوں نہیں ملیں؟ کیا انہیں چاندی کے پھُول پسند نہیں آئے؟

موتی: لعنت بھیجو ان پر۔۔۔ انہی پھولوں کی وجہ سے ملکہ اب پھر ہمیں جنگل میں بھیجنا چاہتی ہے۔ وہ ہم سے چاندنی کے پھولوں کی ایک اور ٹوکری منگوانا چاہتی ہے۔ شاید تمہیں ایک بار پھر وہاں جانا پڑے۔ میری اچھی باجی! جاؤ گی نا؟ بولو تم خاموش کیوں ہو؟ اگر تمہیں اکیلے وہاں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔

رانی: دیکھو پھُول! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری خوشامد کر سکیں، اگر تم نے ہماری مدد نہیں کی تو ملکہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے سر قلم کرا دے گی۔

پھُول: میں وہاں نہیں جا سکتی۔

موتی: بس تو پھر ہم مارے جائیں گے۔

رانی: پھُول میری بچّی! میں خود وہاں جانے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے تو پتا ہی کچھ

نہیں ہے۔ تم کم سے کم مجھے راستہ ہی بتا دو۔ پھُول: میں نہیں بتاؤں گی۔

رانی: میں نے اتنی مدّت تجھے کھلایا پلایا ہے، پالا پوسا ہے۔ تو چھوٹی سی تھی جب تیری ماں مر گئی تھی۔ تب سے میں نے ہی مجھے ماں بن کر پالا ہے۔ لیکن تو اِتنی پتھر دل ہے کہ اس مصیبت کے وقت ہماری امداد نہیں کرتی۔ ہائے میرے اللہ! کیا نیکی کا یہی صلہ ہے؟

موتی: ہم تو کہیں چھُپ بھی نہیں سکتے جہاں بھی جائیں گے ملکہ کے سپاہی ڈھونڈ کر پکڑ لیں گے۔

یہ کہہ کر دونوں ماں بیٹی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ پھول کے دل پر چوٹ سی گئی۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور بولی۔

پھُول: اچھا! میں کوشش کروں گی۔ لاؤ مجھے ٹوکری دو۔

رانی: (خوش ہو کر) پھُول بیٹی! تم کتنی اچھی ہو۔ لو یہ رہی ٹوکری۔

پھُول: ایک بات بتاؤ خالہ! میری انگوٹھی تمہارے پاس ہے؟

رانی: ہاں بیٹی! تم نے وہ انگوٹھی فرش پر گرادی تھی اور تمہاری بہن نے اسے اٹھا لیا تھا۔

پھُول: تو لاؤ مجھے دے دو۔

پھُول کی یہ بات سُن کر رانی نے موتی کی طرف دیکھا اور موتی نے رانی کی طرف۔ موتی انگوٹھی واپس دینا نہیں چاہتی تھی۔ ماں بیٹی نے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ باتیں کیں۔ پھر رانی کہنے لگی۔

رانی: میرے اللہ! ہم سے کتنی بڑی غلطی ہوئی۔ ہمیں تم کو بتانا یاد نہیں رہا کہ وہ انگوٹھی تو ہم سے ملکہ نے لے لی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب تک پھولوں سے بھری ہوئی ایک اور ٹوکری نہیں آئے گی، وہ اشرفیاں اور انگوٹھی اپنے پاس رکھے گی۔

پھُول: لیکن اسے میری انگوٹھی کا پتا کیسے چلا؟

رانی: یہ سب تمہاری بہن کی غلطی ہے اس نے وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی

تھی۔ ملکہ کی نظر فوراً اس پر جا پڑی۔

موتی: ہاں پھُول! اور اس نے دیکھتے ہی اتروالی۔ میں مانتی ہوں کہ یہ میری غلطی تھی لیکن تم ناراض نہ ہونا پھول! ملکہ کو چاندنی کے پھولوں ایک اور ٹوکری مل گئی تو وہ انگوٹھی واپس کر دے گی۔۔۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔

پھُول: لیکن وہ اس انگوٹھی کا کیا کرے گی؟ اس کے پاس تو اس سے بھی اچّھی بیسیوں انگوٹھیاں ہوں گی۔

یہ کہہ کر وہ پھر فرش پر بیٹھ گئی۔ موتی گھبرا گئی اور کہنے لگی۔

موتی: کیا بات ہے تم پھر فرش پر کیوں بیٹھ گئی ہو؟ کیا تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے یا چاہتی ہو کہ میں تمہارے پاؤں پکڑ کر خوشامد کروں۔

پھُول: جی تو میرا یہی چاہتا ہے۔ آخر تمہیں اپنی بے وقوفی کی کچھ تو سزا ملے۔ تمہیں میری انگوٹھی وہاں نہیں لے جانی چاہیے تھی اور لے گئی تھیں تو ملکہ کو نہیں دینی چاہیے تھی۔ لیکن میں تمہارے ساتھ وعدہ کر چکی ہوں۔ اس لیے

جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔

موتی: اور میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔

پھُول: نہیں میں اکیلی جاؤں گی۔

رانی: اچھا جیسے تمہاری مرضی۔ تم اکیلی جانا چاہتی ہو تو اکیلی ہی چلی جاؤ لیکن خدا کے لیے جلدی کرو۔

پھُول ٹوکری لے کر فرش سے اُٹھی اور خاموشی کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی رانی اور موتی دونوں کھڑکی میں آ کھڑی ہوئیں اور اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ جب وہ گلی کا موڑ مُڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو رانی نے کہا۔

رانی: دیکھو بیٹی! تم اس کے پیچھے پیچھے جاؤ اور میں محل میں جا کر ملکہ کو بتاتی ہوں کہ میں نے اپنی بھانجی اور بیٹی کو جنگل کی طرف بھیج دیا ہے۔ لیکن دیکھنا اسے تمہارا اپتا نہ چلنے پائے۔۔۔ تم جانتی ہی ہو کہ وہ کتنی بد دماغ ہے۔۔۔ اُسے پتا چل

گیا تو وہ واپس آ جائے گی اور پھر ہماری خیر نہیں۔

موتی: بہت اچھا امّاں! میں پوری احتیاط کروں گی۔ اب تم یوں کرو کہ جلدی سے مجھے بہُت سی رنگ دار کترنیں دے دو۔

رانہ: ان کا کیا کرو گی؟ کیا جنگل میں بیٹھ کر گڑیاں کھیلو گی؟

موتی: میں یہ کترنیں درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں میں باندھتی جاؤں گی۔ اگر میں نے اپنے پیچھے کوئی نشانی نہ چھوڑی تو پھر تمہیں اور ملکہ کو جنگل میں راستہ کیسے ملے گا۔

رانی: تم بہُت عقلمند ہو بیٹی! بہت ہی عقلمند۔ بس اب تم جلدی سے پھُول کے پیچھے پیچھے جاؤ اور ملکہ کا جلوس تمہارے پیچھے پیچھے آئے گا۔

یہ کہہ کر رانی نے جلدی جلدی گھر میں سے رنگدار کترنیں جمع کیں اور ان کی ایک پوٹلی بنا کر موتی کے حوالے کر دی۔ پوٹلی لیتے ہی موتی پھُول کے پیچھے پیچھے چل دی اور رانی محل کی طرف روانہ ہو گئی۔

دو راستے

پھول آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی جنگل میں جا پہنچی۔ رات بھر برف پڑتی رہی تھی۔ کیا درخت اور کیا جھاڑیاں، سب نے برف کا سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ضرور بھٹک کر رہ جاتا لیکن پھُول کے لیے اس جنگل کا اکثر حصّہ دیکھا بھالا تھا۔ وہ بغیر کسی دقّت کے اس درخت کے قریب پہنچ گئی جہاں اسے بارہ مہینوں کا الاؤ نظر آیا تھا۔

اس نے اس درخت کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور سوچنے لگی کہ بوڑھے برگد کا وہ درخت بھی زیادہ دور نہیں ہو گا جس کے پاس سے دو راستے نکلتے ہیں۔ دائیاں راستہ بارہ مہینوں کے الاؤ کی طرف جاتا ہے اور بایاں کہیں بھی نہیں جاتا اور ذرا آگے بڑھی تو اسے وہ درخت بھی نظر آ گیا اور اس کے پاس سے نکلے ہوئے دو راستے بھی دکھائی دینے لگے۔

وُہ یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی کہ دائیں طرف کو جانے والا راستہ تنگ اور اُونچا نیچا

ہے، اور ایک خطرناک ڈھلان کی طرف جاتا ہے اور بائیں طرف کو جانے والا راستہ ہموار، کشادہ اور صاف ہے اور دور تک چلا گیا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ یہی وہ راستہ ہے جو کہیں بھی نہیں جاتا اور اس پر چلنے والا راستے میں ہی کہیں مر کھپ کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس نے ذرا غور سے دیکھا تو اس راستے پر کافی دور ایک جھیل بھی دکھائی دی۔

وہ سوچنے لگی کہ یہ بایاں راستہ اتنا صاف اور ہموار ہے کہ ناواقف آدمی ہر صورت میں یہی راستہ پسند کرے گا لیکن میں یہ راستہ اختیار نہیں کروں گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ راستہ تباہی کا راستہ ہے۔ دوسرا راستہ اگرچہ تنگ اور خطرناک نظر آتا ہے لیکن میں اسے ہی اختیار کروں گی کیونکہ یہی راستہ مجھے بارہ مہینوں کے الاؤ تک لے جائے گا۔

اب وہ برگد کے درخت کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ اُس نے اپنی چادر کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا۔ پھر وہ دائیں طرف کو جانے والے راستے پر جانے ہی لگی تھی کہ اسے ایک چیخ سنائی دی۔ وہ فوراً رُک گئی اور چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا

تو حیران رہ گئی۔ یہ موتی تھی۔

پھُول: (غصّے سے) تم کہاں سے آن ٹپکیں؟

موتی: ابھی بتاتی ہوں۔ ذرا سانس لے لوں۔ اس درخت پر سے اتنی ڈھیر ساری برف میرے اوپر گری کہ میری تو جان ہی نکل گئی۔

پھُول: تم نے میرا پیچھا کیوں کیا۔

موتی: امّاں نے مجھے بھیجا ہے۔

پھُول: اب میں آگے نہیں جاؤں گی۔ میں نے غلطی کی جو تم پر ترس کھایا۔

موتی: تم اب واپس نہیں جا سکتیں! ملکہ اور اس کے درباریوں کا جلوس ہمارے پیچھے پیچھے آرہا ہے اور اماں ان کے ساتھ ہیں۔ وہ کوئی دم میں یہاں پہنچا ہی چاہتے ہیں۔

پھول: انہیں یہاں تک آنے کا راستہ کیسے معلوم ہوا؟

موتی: میں اپنے پیچھے درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں میں کپڑے کی کترنیں

باندھ آئی ہوں۔ اب جلدی سے وہ جگہ دکھادو جہاں چاندی کے پھول ہیں اور ہیرے کی انگوٹھیاں ملتی ہیں۔

پھُول: میں بھی کتنی احمق ہوں!

موتی: تم بالکل ٹھیک کہتی ہو لیکن حماقت پر افسوس کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اب تم واپس نہیں جا سکیں۔ ملکہ ہمارے ساتھ تمہارا سر بھی قلم کر دے گی۔

پھُول نے تھوڑی دیر کچھ سوچا۔۔۔ اسے وہ تمام وعدے یاد آ گئے جو اس نے بارہ مہینوں کے ساتھ کیے تھے۔ اس نے اپنے جی میں کہا مجھے دائیں طرف جانے والے راستے کا راز ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کہنے لگی۔

پھُول: اچھا میں آگے چلتی ہوں۔

موتی: بتاؤ اب ہمیں کس طرف جانا ہے؟پھُول: (بائیں طرف اشارہ کر کے) اس طرف۔

موتی: بُہت خُوب۔ یہ راستہ صاف بھی ہے اور کُشادہ بھی۔

یہ کہہ کر موتی نے اس راستے پر ایک چھوٹی سی جھاڑی میں رنگ دار کپڑے کی ایک کترن باندھ دی۔پھُول رک گئی اور بولی۔

پھُول: میری بات مان لو تو اچھا ہے۔ تمھیں میرے پیچھے نہیں آنا چاہیے۔

موتی: تم اپنا کام کرو۔ میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

پھول: اچھّا، جیسے تمہاری مرضی۔

یہ کہہ کر پھُول آگے بڑھ گئی اور موتی بھی اس کے پیچھے ہولی۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ملکہ کے سپاہی پھاوڑوں اور بیلچوں کی مدد سے راستہ بناتے ہوئے وہاں تک پہنچے۔ بوڑھا سپاہی بہادر اور محل کا داروغہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

ایک سپاہی: میرے خدا! یہ راستہ تیار کرنا بھی ہمارے لیے عذاب سے کم نہیں ہے، اور اب تو مجھے کوئی نشانی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ کہیں ہم راستہ تو نہیں بھول گئے؟

داروغہ: نہیں بھئی نہیں۔ وہ دیکھو سامنے ایک جھاڑی میں رنگ دار کپڑے کی کترن بندھی ہوئی ہے۔

سپاہی: ٹھیک ہے! ذرا تیز ہاتھ چلاؤ۔ لعنت ہے چاندی کے پھُولوں پر جس نے ہمیں اس مُصیبت میں ڈالا ہے!

بہادر: ہم سپاہیوں کی زندگی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ صبح مصیبت، شام مصیبت، دن مصیبت، رات مصیبت۔ لیکن وہ سپاہی ہی کیا جو ان سے گھبرا جائے۔

وہ یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ ملکہ وزیراعظم، ماسٹر صاحب اور رانی کے ہمراہ وہاں پہنچی۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹوکری تھی۔

ملکہ: (ماسٹر صاحب سے) ماسٹر صاحب! آپ کہا کرتے ہیں کہ جنگل میں قسم قسم کے جانور ہوتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟ فوراً مجھے دکھایئے۔

ماسٹر صاحب: میرا خیال ہے کہ وہ سو رہے ہوں گے۔

ملکہ: (حیرانی سے) سو رہے ہیں۔ لیکن یہ تو دن کا وقت ہے۔

ماسٹر صاحب: حضور! بُہت سے جانور سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی سو جاتے ہیں اور بہار کا موسم شروع ہونے تک سوتے رہتے ہیں۔ جب برف پگھلنی شروع ہوتی ہے تب کہیں جاگتے ہیں۔

ملکہ: (حیران ہو کر) بڑے تعجب کی بات ہے وہ اتنے مہینے کیسے سوتے رہتے ہیں؟ انہیں بھوک پیاس نہیں لگتی؟

اتنے میں ملکہ کی نظر ان سپاہیوں پر پڑی جو بیلچوں اور پھاوڑوں سے راستہ صاف کر رہے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایک سپاہی نے پہلے تو اپنی ٹوپی اتار دی اور پھر وردی بھی اتار ڈالی۔ اسے دیکھ کر دوسرے سپاہیوں نے بھی ایسا ہی کیا اور پھر بیلچے اور پھاوڑے چلانے میں مشغول ہو گئے۔ ملکہ: یہ کیا بات ہے ماسٹر صاحب؟ ہم نے تو اوپر نیچے دو دو تین تین گرم لباس پہن رکھے ہیں اور پھر بھی سردی سے مرے جا رہے ہیں اور ادھر ان سپاہیوں نے اپنی وردیاں بھی اُتار پھینکی ہیں؟

ماسٹر صاحب: (سردی سے کانپتے ہوئے) یہ تو بڑی سیدھی سی بات ہے ملکہ

حضور! محنت سے خُون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور اس سے آدمی کا بدن گرم ہو جاتا ہے۔

ملکہ: محنت! خُون کی گردش! میں نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں ان سپاہیوں سے پوچھتی ہوں۔ بلایئے انہیں۔

وزیر اعظم لپک کر دو سپاہیوں کو بلا لایا۔ ان میں ایک تو وہی بہادُر تھا اور دوسرا ایک نوجوان سپاہی شیر۔ شیر نے ملکہ کے سامنے آکر اپنی پیشانی سے پسینا پونچھا تو ملکہ نے کہا۔

ملکہ: تم نے اپنا ماتھا کیوں پونچھا؟

شیر: میں معافی چاہتا ہوں حضور؟

ملکہ: میں نے معاف کیا لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

شیر: بے وقوفی کی وجہ سے حضور! خُدا کے لیے آپ ناراض نہ ہوں۔

ملکہ: مگر میں ناراض نہیں ہوں۔ تم ڈرو مت۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اپنا ماتھا کیوں پونچھا

تھا؟

شیر:(گھبراکر)مجھے پسینا آرہا تھا حضور !

ملکہ: پسینا آرہا تھا! کیا مطلب؟

بہادر: اسے گرمی محسوس ہو رہی تھی حضور!

ملکہ: تمہیں بھی گرمی محسوس ہو رہی ہے؟

بہادر: جی حضور!

ملکہ: کیوں؟

بہادر: بیلچہ اور پھاوڑا چلانے کی وجہ سے!

ملکہ: اچھا تو یہ بات ہے۔ میں حکم دیتی ہوں کہ سب لوگ بگھّیوں سے اتر آئیں اور بیلچے اور پھاوڑے لے کر راستہ بنائیں۔ اور ایک پھاوڑا مجھے بھی دو۔

ملکہ کا حکم تھا۔ سب لوگ بگھّیوں سے اتر آئے۔ کسی نے بیلچہ سنبھالا اور کسی نے پھاوڑا اور پھر راستے سے برف ہٹانے لگے۔ ملکہ نے بھی ایک پھاوڑا لے کر الٹے

سیدھے ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُس نے پھاوڑا ہاتھ سے رکھ دیا اور پیشانی پونچھتے ہوئے ان سے کہنے لگی۔

ملکہ: سپاہی ٹھیک کہتے ہیں۔ واقعی اس طرح گرمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مجھے پسینا آگیا ہے۔ اچھا! اب پھینک دو اپنے بیلچے اور پھاوڑے۔ اتنا ہی کافی ہے۔

یہ سن کر سب لوگوں نے بیلچے اور پھاوڑے پھینک دیے اور ملکہ کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ صرف سپاہی اپنے کام میں لگے رہے۔

ملکہ: اب ہمیں کس طرف جانا ہے؟

رانی: اس طرف ملکہ حضور! یہ دیکھیے میری بیٹی نے اس جھاڑی میں نشانی باندھ دی ہے تاکہ آپ کو راستہ تلاش کرنے میں دقّت نہ ہو۔

ملکہ: (خُوش ہو کر) آؤ آگے چلیں۔ بگھّیوں اور گھوڑوں کو یہیں رہنے دو۔ پیدل چلنے سے گرم رہیں گے اور سردی نہیں لگے گی۔

انگوٹھی کی کرامت

پھُول اب جھیل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ موتی گرتی پڑتی اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ پھُول رک گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ اس نے پھُول کے پاس آ کر کہا۔

موتی: تم تو اتنی تیز چلتی ہو کہ مجھے حیرانی ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگل کا ایک ایک کونا تمہارا دیکھنا بھالا ہے۔ میرا حال دیکھو، پہلے میں ایک گڑھے میں گر پڑی اور مرتے مرتے بچی۔ پھر ایک جھاڑی میں اُلجھ کر رہ گئی جس سے میرے چہرے پر خراشیں آ گئیں۔ توبہ! کتنا خوفناک راستہ ہے۔

پھُول: آگے شاید اس سے بھی برا حال ہو۔ موتی: تم تو مجھے ڈرا رہی ہو!

پھُول: میں تمہیں ڈرا نہیں رہی۔ حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ بہتر ہے کہ تم واپس چلی جاؤ اور ملکہ سے کہہ دو کہ وہ فوراً اس جنگل سے نکل جائیں۔ اگر انہیں اپنی جان پیاری ہے۔

موتی: نہیں مجھے واپس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملکہ مجھے پھانسی پر لٹکا دے گی۔ تم یہ بتاؤ کہ ہمیں ابھی اور کتنا راستہ طے کرنا ہے۔

پھُول؛ ابھی بُہت سفر باقی ہے۔ کم سے کم تین چار مہینے لگ جائیں گے۔

موتی: تین چار مہینے!

موتی: لیکن تم کل بھی تو یہاں سے پھُولوں کی ٹوکری بھر کر لے گئی تھیں۔

پھُول: کل دور جا چکا ہے موتی! تم اسے کبھی نہیں پکڑ سکتیں۔

موتی: میں کُچھ نہیں سمجھی کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟

پھُول: تمہیں دکھائی نہیں دے رہا؟ اس جھیل سے آگے یہ راستہ پہاڑی کی طرف جاتا ہے۔

موتی: اور اس سے آگے؟

پھُول: اور اس سے آگے کہیں بھی نہیں جاتا۔

موتی: تمہاری باتوں سے مجھے ڈر لگ رہا ہے! خدا کرے کہ وہ لوگ جلدی یہاں آ جائیں۔

وہ یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ سپاہی وہاں آ پہنچے۔ بہادر نے دیکھتے ہی پھُول کو پہچان لیا۔ وہ سیدھا اس کی طرف آیا اور کہنے لگا۔

بہادر: ارے پھُول بیٹی! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟

پھول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

پھُول: آپ واپس چلے جائیں۔ یہ راستہ بہُت خطرناک ہے۔

بہادُر: تم بالکل ٹھیک کہتی ہو بیٹی! ہمارے گھوڑے بھی آگے نہیں بڑھتے۔ وہ واپس جانا چاہتے ہیں لیکن ملکہ کا حکم ہے اس لیے ہم آگے بڑھنے پر مجبور ہیں۔ خدا جانے کہ یہ سفر کہاں جا کر ختم ہو گا۔ ختم ہو گا بھی یا نہیں۔

اتنے میں پیچھے آتے ہوئے لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس طرف چلیے حضور"!

”ذرا سنبھل کر قدم رکھیے ملکۂ عالیہ“!

”یہ جھاڑی پکڑ لیجیے ملکہ حضور“!

”دیکھیے حضور! احتیاط سے قدم رکھیے“!

”کہیں پھسل نہ جایئے گا حضور“!

سب سے پہلے رانی جھیل پر آئی۔ جھیل کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو گئی اور اپنے آپ سے کہنے لگی۔

رانی: اللہ! یہ تو سچ مچ کی جھیل ہے۔ قربان جایئے خُدا کی شان کے۔ کبھی کبھی وہ ہماری زبان سے نکلے ہوئے جھوٹ کو بھی سچ کر دیتا ہے۔

اتنے ہیں ملکہ اپنے درباریوں کے ساتھ جھیل کے کنارے آ پہنچی۔ اُسے دیکھتے ہی رانی نے جھک کر آداب کیا اور بولی۔

رانی: ملکہ حضور! یہ وہی وہ جھیل جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ اور یہ رہی میری بیٹی موتی اور میری بھانجی پھُول۔۔۔۔

ملکہ : اچھّا! (درباریوں سے) اب شاید تم لوگ جلد محل واپس جا سکو گے۔ ہمیں لڑکی مل گئی ہے۔ اس کو معلُوم ہے کہ سردیوں میں چاندنی کے پھُول کہاں کھلتے ہیں۔

ملکہ نے پھُول کو اپنے پاس بلایا اور پھر اُسے غور سے دیکھ کر بولی۔

ملکہ : میں تو سمجھی تھی کہ تم کوئی یونہی سی لڑکی ہو گی لیکن تم تو بڑی پیاری لڑکی ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے ماسٹر صاحب؟

ماسٹر صاحب : میرا خیال یہ ہے ملکہ حضور کہ اس پیاری لڑکی کو گرم کپڑوں کی سخت ضرورت ہے، دیکھیے بے چاری سردی سے نیلی ہُوئی جا رہی ہے۔

ملکہ : آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم ابھی اسے ایک گرم چغہ اور ایک شال دیتے ہیں۔

یہ کہہ کر ملکہ نے اپنے خادم کو اشارہ کیا۔ خادم فوراً بگھّیُوں کی طرف گیا اور ذرا سی دیر میں ایک چغہ اور شال لے آیا۔ پھُول نے چغہ لے کر پہن لیا اور شال اوڑھ

لی اور پھر جھک کر ملکہ کا شکریہ ادا کیا۔ ملکہ: تمھیں ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔ آج ہی تمھیں خالص سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری، مخمل کے بارہ جوڑے، سنہری جوتے، گلوبند اور ہاتھ کی ہر انگلی کے لیے ہیرے کی ایک ایک انگوٹھی انعام میں دی جائے گی۔ تمھیں یہ چیزیں چاہئیں؟

پھُول: جی نہیں شکریہ۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔

ملکہ: (حیرانی سے) کچھ نہیں چاہیے۔

پھُول: میں صرف ایک انگوٹھی چاہتی ہوں۔ مجھے آپ کی دس انگوٹھیاں نہیں، اپنی اور صرف اپنی انگوٹھی چاہیے۔

ملکہ: تمہاری انگوٹھی؟

پھُول: جی ہاں! میری انگوٹھی جو آپ نے میری بہن موتی سے لی ہے۔

ملکہ: یہ کیا کہہ رہی ہے؟

رانی: یہ بکواس کر رہی ہے حضور!

موتی: اس کے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔

پھُول: اچھا تو یہ بات ہے۔ میں سمجھ گئی تمہاری چال کو، تم جھوٹ بولتی رہی ہو۔ تم اپنے مُجھ سے یونہی کہہ دیا تھا کہ انگوٹھی ملکہ نے لے لی ہے۔

رانی: (غصے سے) ہوش میں آؤ پھُول۔ بکواس مت کرو۔

ملکہ: ہم ابھی دیکھتے ہیں کہ یہ انگوٹھی کا کیا چکر ہے۔ لاؤ یہ انگوٹھی مجھے دے دو۔

رانی: (گھبر اکر) لیکن ملکہ حضور۔۔۔

ملکہ: لیکن ویکن کچھ نہیں۔ فوراً انگوٹھی میرے حوالے کر دو۔ نہیں تو اچھا نہیں ہو گا۔

رانی: لیکن وہ انگوٹھی تو اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے حضور!

موتی: ہم اسے گھر میں ہی رکھ آئے تھے حضور!

ملکہ: تو جاؤ اور بھاگ کر انگوٹھی لے آؤ۔ اور دیکھو ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑے۔

موتی : (گھبرا کر) ٹھہریے میں اپنی جیبیں دیکھتی ہوں۔ ممکن ہے یہ انگوٹھی میری کسی جیب میں ہی پڑی ہو۔

موتی نے جلدی جلدی جیبوں کی تلاشی لی اور پھر ایک جیب سے انگوٹھی نکال کر ملکہ کو دے دی۔

موتی: لیجیے حضور! یہ رہی وُہ انگوٹھی۔

ملکہ :(انگوٹھی لے کر) یہ تو بڑی پیاری انگوٹھی ہے۔ تمہیں کہاں سے ملی؟

پھُول: یہ ایک تحفہ ہے حضور!

ملکہ: یہ کِس نے دیا ہے؟

پھُول: یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔

ملکہ: تمہاری ہر بات پہیلی معلوم ہوتی ہے۔ تم یہ انگوٹھی واپس لے سکتی ہو۔

پھُول: شکریہ حضور! آپ کا بُہت بُہت شکریہ۔

ملکہ: لیکن ابھی نہیں۔ پہلے تمہیں وہ جگہ ہمیں دکھانی ہوگی جہاں سے کل تم نے

چاندنی کے پھُول توڑے تھے۔ فوراًا بھی اسی وقت۔

پھُول: تو پھر میں انگوٹھی نہیں لُوں گی۔

ملکہ: نہیں لو گی تو میں اس کا قصّہ ہی پاک کیے دیتی ہوں۔ یہ لو۔ دیکھو۔ یہ جھیل میں جا رہی ہے۔ اب بھی بتا دو کہ پھُول کہاں ہیں؟

پھُول خاموش رہی۔ ملکہ نے جھوٹ موٹ اپنا بازو جھیل کی طرف لہرایا جیسے اس نے انگوٹھی جھیل میں پھینک دی ہو۔ پھُول رونے لگی۔ پھُول: ہائے میری انگوٹھی۔

ملکہ: تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہاری انگوٹھی جھیل میں پھینک دی ہے؟ نہیں۔ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔ بتاؤ کہ چاندنی کے پھول کہاں ہیں؟ میں تمہیں ایک اور موقع دیتی ہوں۔۔۔۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

پھول: میں نہیں بتاؤں گی۔

ملکہ: تو انگوٹھی اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کی بھی خیر مناؤ۔ پکڑ لو اسے۔

یہ کہہ کر ملکہ نے انگوٹھی جھیل میں پھینک دی اور اس کے ساتھ ہی سپاہی پھُول کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن انگوٹھی کے جھیل میں گرتے ہی پھُول نے وُہ گیت گانا شروع کیا جو اپریل نے اسے بتایا تھا۔

چل ری مری انگوٹھی چل

ہو کے بہار کی وادی سے

جونہی پھُول کا گیت ختم ہوا، برف کا طوفان شروع ہو گیا۔ چاروں طرف برف کے گالے اُڑنے لگے۔ ملکہ، درباری، رانی، موتی، سپاہی، غرض سب اپنی اپنی پڑ گئی اور وہ اپنے آپ کو برف کے طوفان سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی افراتفری میں اچانک بگل کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی جنوری اور فروری کے مہینے آئے اور پھُول کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

اس کے بعد تیز ہوا چلنی شروع ہو گئی اور ملکہ کے ساتھوں کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ سب لٹّو کی طرح ناچنے لگئے۔ سب کو اپنی اپنی فکر تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

پھر برف اور تیز ہوا کا یہ طوفان تھم گیا۔ ہوا تھم گئی۔ سورج نکل آیا اور برف پگھلنے لگی۔ یہ گویا مارچ کا موسم تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپریل کی بہار آگئی۔

درخت سرسبز ہو گئے اور ہر طرف پھُول ہی پھول نظر آنے لگے جن میں چاندنی کے پھُول بھی تھے۔

ملکہ اور اس کے ساتھیوں نے حیرانی سے یہ منظر دیکھا اور ملکہ بے ساختہ پکار اُٹھی۔

ملکہ: بہار آگئی۔ ماسٹر صاحب: یہ ناممکن ہے۔

ملکہ: کیسے ناممکن ہے، دیکھتے نہیں۔ درختوں میں نئے پتّے نکل رہے ہیں۔ ارے ہاں! وہ لڑکی کہاں ہے؟

رانی: وہ بھاگ گئی ہے حضور!

وزیر اعظم: سپاہیو! دوڑو۔ پکڑو۔ جانے نہ پائے۔

ملکہ: رہنے دو اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں چاندنی کے پھُول مل گئے

ہیں۔۔۔ چلو سب لوگ جلدی سے اپنی اپنی ٹوکریاں بھر لو۔

وزیر اعظم: لیکن ہمیں تو چاندنی کے پھُول کہیں دکھائی نہیں دے رہے حضور!

ملکہ: ہیں! ابھی تو نظر آرہے تھے اور ابھی غائب ہو گئے! یہ کیا ہوا؟

اپریل کے بعد اب مئی کا موسم آگیا تھا۔ سورج کی تپش تیز ہو گئی تھی۔ مئی کے بعد جُون کا موسم آیا۔ ملکہ اور اس کے درباری جو بھاری بھر کم گرم لباس پہنے ہوئے تھے، انہوں نے اتار کر پھینک دیے۔ گرمی بڑھتی جارہی تھی اور اب جولائی کا موسم آچکا تھا۔ ماسٹر صاحب دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ان کی طرح ملکہ اور دوسرے درباری بھی حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

گرمی بڑھی تو ملکہ کے پیاس محسوس ہوئی اور وزیر اعظم نے پانی کا ایک گلاس لانے کا حکم دیا۔ بہادر گلاس لے کر جھیل کے کنارے پہنچا تو آسمان پر بادل اُمنڈ آئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اتنے میں بہادر پانی کا گلاس لے کر آگیا۔

بہادر: یہ پانی لیجیے حضور!

ملکہ: اب میں کیا کروں۔ دیکھتے نہیں، میں خود بری طرح بھیگ گئی ہوں۔ چھتری لاؤ، جلدی سے کوئی چھتری لاؤ۔

وزیر اعظم: یہاں چھتری کہاں سے آسکتی ہے حضور! ہم محل سے جنوری میں چلے تھے اور اب اگست کا سا موسم ہے۔

اِتنے میں اندھیرا ہو گیا اور بارش کے ساتھ ساتھ بڑے زور کی آندھی بھی چلنے لگی۔ ملکہ اور اس کے درباریوں نے جو گرم چغے اور شال اُتار پھینکے تھے، آندھی ان سب کو اڑا کر لے گئی۔ ملکیہ: (چیخ کر) چلو فوراً محل واپس چلو۔ بگھّیوں کو یہاں لے آؤ۔

وزیر اعظم: موسلا دھار بارش سے راستے میں سخت کیچڑ پر ہو گئی ہے حضور! کیچڑ میں بگھّیاں نہیں چل سکتی۔ گھوڑوں پر بیٹھ کر ہی واپس جا سکتے ہیں۔

یہ سن کر سب درباری بگھّیوں کی طرف بھاگے اور جس کے ہاتھ جو بھی گھوڑا لگا، اسی پر بیٹھ کر بھاگ گیا۔ ملکہ چیختی چلاتی رہی لیکن کسی نے اس کی نہیں سُنی۔ کچھ دیر بعد وہاں یا تو خالی بگھّیاں باقی رہ گئیں یا رانی، موتی، بہادر، ملکہ اور ماسٹر

صاحب۔ باقی سب لوگ بھاگ گئے تھے۔

اب بارش تھم چکی تھی اور ہوا پھر سرد ہونے لگی تھی۔ ہوتے ہوتے خزاں سے پھر سردی کا موسم آ گیا اور برف کے گالے ہوا میں اڑنے لگے۔ اس طرح تھوڑے تھوڑے سے وقفے میں بارہ مہینوں نے باری باری آ کر اپنا اپنا رنگ دکھا دیا تھ۔ سردی کے بعد بہار، پھر گرمی، پھر برسات، پھر خزاں اور پھر سردی آ گئی تھی۔ ملکہ نے برف کے گالے اڑتے ہُوئے دیکھے تو کہنے لگی۔

ملکہ: ارے! یہ تو پھر سردی آ گئی ہے۔ میرا چغہ لاؤ مُجھے سردی لگ رہی ہے۔

بہادر: چُغہ کہاں سے لاؤں حضور! آندھی تو سب کپڑے اُڑا کر لے گئی ہے۔

ملکہ: ہائے! اب کیا کروں! اچھا ہماری بگھّی لاؤ۔

بہادر بگھّی لینے چلا گیا تو رانی نے کہا۔

رانی: میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا حضور کہ آپ کو جنگل میں نہیں جانا چاہیے۔



موتی: چاندنی کے پھولوں کے لیے مری جا رہی تھیں۔

ملکہ : اور تم اشرفیوں کے لیے دیوانی ہو رہی تھیں۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ گستاخی سے نہیں بولنا چاہیے؟ تمہیں معلُوم نہیں اس کی سزا کیا ہے؟ میں ابھی تمہاراسر قلم کرا سکتی ہوں۔

رانی: میری بیٹی نادان ہے حضور! اسے خیال نہیں رہا تھا۔۔۔ آپ اسے معاف کر دیجیے۔

اتنے میں بہادر واپس آ گیا۔

بہادُر: حضور بگھّیاں تو موجود ہیں لیکن انہیں کھینچنے کے لیے گھوڑا ایک بھی نہیں۔

ملکہ : گھوڑا ایک بھی نہیں۔ کہاں گئے سب گھوڑے؟

بہادُر: آپ کے درباری گھوڑوں پر بیٹھ کر بھاگ گئے۔

ملکہ : اچھا تو یہ سب نمک حرام نکلے۔ کوئی بات نہیں۔ میں ان کو ایسی سزا دوں گی کہ ان کی سات پشتیں یاد رکھیں گی۔ (کچھ سوچتے ہوئے) لیکن میں یہ سزا تو محل میں پہنچنے کے بعد ہی دے سکتی ہوں۔

بہادُر: کوئی آدمی آرہاہے حضور!

ملکہ: کہاں ہے؟ ارے! یہ تو کوئی بُڈّھا ہے۔

ایک بوڑھا شخص آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ان کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا سفید ڈنڈا تھا۔ اس نے لمبے لمبے بالوں کی سفید ٹوپی پہن رکھی تھی اور اس کا ڈھیلا ڈھالا لمبا سا چُغہ بھی سفید رنگ کا تھا۔ بالکل برف کی طرح۔ یہ جنوری کا مہینا تھا۔ اس نے ملکہ سے کہا۔

جنوری: تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟

ملکہ: چاندنی کے پھُول اکٹھے کرنے۔

جنوری: یہ تو چاندنی کے پھولوں کا موسم نہیں۔

ماسٹر صاحب: آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔

ملکہ: واقعی ہم غلط موسم میں یہاں آگئے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہم یہاں سے واپس کیسے جائیں؟

جنوری: جس طرح تم یہاں آئے تھے۔

بہادُر: ہم یہاں بگھیوں میں آئے تھے۔ اب صرف بگھیاں رہ گئی ہیں اور گھوڑے جا چکے ہیں۔ آپ تو اس جنگل سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔

جنوری: ہاں! لیکن صرف سردیوں میں۔

ملکہ: تو پھر ہماری مدد کیجیے بابا! میں آپ کو بہُت بھاری انعام دوں گی۔۔۔ سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات۔

جنوری: مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ہر چیز موجود ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

ملکہ: میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ محل میں واپس پہنچ جاؤں۔ لیکن ہمارے پاس بگھی کو کھینچنے لیے گھوڑے نہیں ہیں۔ اور کُچھ نہیں تو ہمیں کوئی گدھا ہی مل جائے جو بگھی کو کھینچ سکے۔

جنوری: تمہیں گدھا مل جائے گا۔ (ماسٹر صاحب سے) اور تمہاری کیا خواہش

ہے؟

ماسٹر صاحب: میں چاہتا ہوں کہ ہر چیز اپنی اپنی صحیح جگہ پر ہو جائے۔ سردیوں میں سردی اور گرمیوں میں گرمی۔

جنوری: اس کا بندوبست ہو جائے گا (بہادُر سے) اور تم کیا چاہتے ہو؟

بہادُر: میں؟ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آگ تاپ کر ذرا اپنے آپ کو گرم کر لوں۔

جنوری: یہاں قریب ہی آگ جل رہی ہے۔ وہاں آگ تاپ سکو گے۔

موتی: (جلدی سے) اور ہمیں دو گرم لباس چاہیں۔ ایک مجھے، ایک امّاں کو۔

یہ سن کر جنوری نے اپنے چُغے کے اندر ہاتھ ڈالا اور دو پوستینیں نکال کر موتی کی طرف بڑھائیں۔

جنوری: لو یہ تم دونوں کے لیے۔

رانی: (ناک بھوں چڑھا کر) معاف کرنا بابا! ہمیں یہ گدھے اور کتّے کی کھال والی

پوستین نہیں چاہیں۔

جنوری: یہ تمہیں لینا پڑیں گی۔ تم اسی قابل ہو۔

رانی نے مجبور ہو کر پوستین لے لی۔ یہ بڑی تھی اور اس پر گدھے کی کھال لگی ہوئی تھی۔ موتی نے دوسری پوستین لے لی۔ یہ چھوٹی تھی اور اس پر کتّے کی کھال لگی ہوئی تھی۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے پوستینیں پہنیں، رانی گدھا بن گئی اور موتی کُتّا۔ گدھا رینکنے لگا اور ان کتّا بھونکنے لگا۔ یہ دیکھ کر ملکہ حیران بھی ہوئی اور خُوش بھی۔ وہ بولی۔

ملکہ: بس اب کام بن گیا۔ اس گدھے کو پکڑ کر بگھّی میں جوت دو۔

بہادُر: (جنوری سے) کاش آپ نے اس کتّے کو بھی گدھا ہی بنا دیا ہوتا۔ کم از کم دو گدھے تو ہو جاتے بگھّی کھینچنے کے لیے۔ جنوری: آپ کی ملکہ نے مُجھ سے صرف ایک جانور کی خواہش کی تھی اور وہ پوری ہو گئی ہے۔

ملکہ: چلو کوئی بات نہیں۔ اب اس کو جلدی سے بگھّی میں جوت دو۔

بہادر نے گدھے کا کان پکڑا اور اسے اس طرف لے گیا جہاں بگھیاں کھڑی تھیں۔ اس نے گدھے کو ملکہ کی بگھّی کے آگے باندھا اور پھر اسے ہانک کر ملک کے پاس لے آیا۔ ملکہ بگھّی میں بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ماسٹر صاحب بیٹھے۔ آگے کوچوان کی نشست پر بہادر بیٹھ گیا۔

جنوری: یہ تمہاری نئے سال کی سواری ہے۔ گھوڑوں والی بگھّی میں تو تم لوگوں نے اکثر سواری کی ہو گی لیکن گدھے والی بگھّی میں سواری کرنے کا موقع تمہیں کبھی نہیں ملا ہو گا۔ (بہادُر سے) اور وہ دیکھو کچھ فاصلے پر روشنی نظر آ رہی ہے۔ اس طرف جاؤ۔ وہاں آگ جل رہی ہے۔ وہاں تم آگ تاپ سکو گے۔ اس طرح تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

یہ کہہ کر جنوری اپنے ڈنڈے سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ بہادُر نے گدھے کو دو تین چھڑیاں لگائیں تو وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کتّا بھی خاموشی سے بگھّی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

پھول کی بگھّی

جنگل میں بارہ مہینے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی پھُول بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ہر مہینا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد الاؤ میں کچھ لکڑیاں پھینکتا اور پھر وُہ سب مل کر گانے لگتے۔

اے آگ تیز اور تیز جل
شعلہ ترا اونچا رہے

جنوری: پھُول بیٹی! تم بھی کُچھ لکڑیاں ڈال دو اس آگ میں۔

پھُول: (چند لکڑیاں اٹھا کر آگ میں ڈالتے ہوئے)

اے آگ تیز اور تیز جل
شعلہ ترا اونچا رہے

جنوری: اب تو تمہیں سردی نہیں لگ رہی ہو گی۔

پھُول: نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں بابا! میں آپ کی بہُت احسان مند ہوں۔ آپ نے دو بار میری جان بچائی ہے۔ لیکن میں آپ سے شرمندہ بھی بہت ہوں۔ مجھ سے وہ انگوٹھی گم ہو گئی ہے۔۔۔

اپریل: انگوٹھی گم ہو گئی ہے؟ سچ مچ؟ بھلا بتاؤ تو میرے ہاتھ میں کیا ہے؟

پھُول: (حیرانی سے) ارے! یہ تو وہی انگوٹھی معلوم ہوتی ہے۔

اپریل: ہاں! یہ وہی انگوٹھی ہے، اسے پہن لو۔ یہ ہر مصیبت میں تمہاری امداد کرے گی۔

پھُول: (انگوٹھی انگلی میں پہنتے ہوئے) میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ یہ انگوٹھی مجھے واپس مل گئی ہے۔ لیکن مجھے اسے گھر لے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کہیں خالہ اور موتی پھر نہ چھین لیں۔

جنوری: نہیں اب کوئی تم سے یہ انگوٹھی نہیں چھینے گا۔ تم اپنے گھر جاؤ گی اور اس

گھر کی ملکہ بن کر رہو گی۔ ہم ہر سال تمہارے ہاں آیا کریں گے۔ مئی : اور تمہارے لیے تحفے لایا کریں گے۔

اتنے میں جنوری نے دسمبر کو کچھ اشارہ کیا۔ دسمبر اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایک طرف کو چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے سر پر ایک بڑا سا صندوق تھا۔ اس نے وہ صندوق لا کر پھُول کے قریب رکھ دیا۔

جنوری: لو! یہ صندوق تمہارے لیے ہے۔

فروری: اس کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھو۔

پھُول نے صندوق کا ڈھکنا اُٹھایا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ صندوق میں قسم قسم کے چغے، سونے اور چاندی کے تاروں سے کڑھے ہوئے اطلس اور کمخواب کے جوڑے اور بہُت سے سُنہری جوتے رکھے ہوئے تھے۔ ان کی چمک دمک سے پھُول کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو گئی۔

پھُول: ہائے اللہ! ایسے قیمتی اور شاندار لباس تو ملکہ کے پاس بھی نہیں ہیں۔

دسمبر: تم ذرا پہن کر تو دیکھو!

پھُول نے صندوق میں سے ایک جوڑا اُٹھایا اور پہن لیا۔ پھر اس نے سنہری جوتے اُٹھائے اور پاؤں میں ڈال لیے۔ اس کے بعد اس نے ایک چُغہ اُٹھا کر پہن لیا۔

اپریل: تم اس لباس میں بالکل شہزادی لگتی ہو پھُول۔ ملکہ تو تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

فروری: لیکن اس لباس اور ان جوتوں کے ساتھ جنگل میں سفر کرنا بڑی زیادتی ہے۔ ٹھہرو۔ میں تمہیں ایک بگھّی لا کر دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر فروری اُٹھا اور ایک طرف کو چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک خوب صورت سی بگھّی کھینچتا ہوا لے آیا۔

جنوری: یہ بگھّی تو بُہت شاندار ہے۔ عام گھوڑے تو اس میں جوتے نہیں جاسکتے۔

مئی: اس کی فکر نہ کرو بھیّا! میں ابھی گھوڑے لاتا ہوں۔

یہ کہہ کر مئی اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایک طرف کو چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس

آیا تو اس کے سات چار نہایت خوب صورت سفید رنگ کے گھوڑے تھے۔ یہ گھوڑے اس نے بگھّی میں جوت دیے اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

جنوری: بُہت خُوب! بُہت خُوب! ان گھوڑوں کا تو جواب نہیں۔ جیسی شان دار بگھّی ہے ویسے ہی شان دار گھوڑے ہیں۔

مارچ: لیکن گھنٹیوں کے بغیر سفر کا مزا کیا آئے گا۔ ٹھہرو میں بگھّی میں چاندی کی گھنٹیاں لگا دیتا ہوں۔ گھوڑے دوڑیں گے تو گھنٹیاں بجیں گی اور بڑا لطف آئے گا۔

یہ کہہ کر مارچ اُٹھا اور ایک طرف کو چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں چاندی کی بُہت سی گھنٹیاں تھیں۔ یہ گھنٹیاں اس نے بگھّی کے چاروں طرف لگا دیں اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

جنوری: اب تو یہ بگھّی بُہت ہی شاندار ہو گئی ہے۔

دسمبر: میں یہ صندوق بھی اس بگھّی میں رکھ دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر دسمبر نے صندوق کو بند کیا اور اسے بگھّی کے پچھلے حصّے میں رکھ کر اپنی

جگہ آن بیٹھا۔ اتنے میں کچھ فاصلے پر گدھے کے رینکنے، کتّے کے بھونکنے اور بگھّی کے پہیّوں کی کھڑڑ کھڑڑ کی آوازیں آئیں۔ اور تھوڑی دیر بعد انسانی آوازیں بھی آنے لگیں۔پھُول نے فوراً پہچان لیا۔ یہ آوازیں ملکہ، بہادر اور ماسٹر صاحب کی تھیں۔

ملکہ آواز: جلدی کرو! تیز تیز دوڑاؤ اس کم بخت گدھے کو۔

ماسٹر صاحب کی آواز: سردی سے جان نکلی جارہی ہے اور یہ گدھا چلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

بہادُر کی آواز: یہ نامراد کتا بھونک کر اسے اور بھی پریشان کررہا ہے۔

پھُول سوچنے لگی کہ ملکہ کے پاس گدھا اور کتا کہاں سے آ گئے! اس کی بگھّی میں تو گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔

پھُول: یہ تو ملکہ اور اس کے آدمیوں کی آوازیں ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ یہ گدھا اور کتّا کہاں سے آ گئے؟

جنوری: تمہیں ابھی پتا چل جائے گا۔ اور ہاں بھائیو! اس آگ میں ذرا اور لکڑیاں ڈال دو۔ میں نے سپاہی سے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہاں آگ تاپے گا۔

پھُول: اُسے ضرور آگ تاپ لینے دیجیے بابا! وُہ بہت نیک دل آدمی ہے، کل اس نے لکڑیاں چننے میں میری مدد کی تھی۔ آج اس نے سردی سے بچنے کے لیے مجھے اپنے دستانے دے دیے تھے۔

جنوری: (دوسرے مہینوں سے) کیا خیال ہے تمہارا بھائیو؟

دسمبر: اگر تم نے وعدہ کیا ہے تو ٹھیک ہے۔

اکتوبر: لیکن سپاہی اکیلا نہیں ہے۔

مارچ : اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے، ایک لڑکی ہے، ایک گدھا ہے اور ایک کتّا بھی۔

پھُول: بوڑھا آدمی بھی بُہت نیک آدمی ہے۔

جنوری: تم ٹھیک کہتی ہو پھُول بیٹی۔ وہ بوڑھا اچھا آدمی ہے۔ ہم اسے بھی آگ

تاپنے کی اجازت دے دیں گے۔ لیکن باقی لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔
وہ لڑکی تو بُہت بد دماغ اور مغرور معلوم ہوتی ہے۔

پھُول؛ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن اب اس کا سارا غرور خاک میں مل گیا ہے۔
آپ اس کی آواز نہیں سنتے؟ اس سے کیسی مسکینی ٹپک رہی ہے۔

اتنے میں ملکہ کی بگھّی ان کے پاس آگئی۔ بہادُر نیچے اُترا اور الاؤ کی طرف آیا۔

بہادُر: واقعی یہاں آگ جل رہی ہے۔ بابا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ (زور سے) بھائیو!
اجازت ہو تو میں ذرا آگ تاپ لوں۔

جنوری: آجاؤ بھائی! آجاؤ تمہیں اجازت ہے۔

بہادُر: (جنوری کو پہچانتے ہوئے) ارے بابا آپ! اجازت ہو تو میں ملکہ اور ان
کے ماسٹر صاحب کو بھی لے آؤں۔

جنوری: اگر تمہاری یہی خُوشی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

بہادُر بگھّی کے پاس گیا اور جھکتے ہوئے بولا۔

بہادُر: باہر تشریف لے آیئے ملکہ عالیہ۔ آپ بھی باہر آجایئے ماسٹر صاحب۔
ملکہ: میں تو حرکت بھی نہیں کر سکتی۔ اُتروں کیسے ؟

بہادُر: میں آپ کو سہارا دیتا ہوں۔ آگ تاپنے کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

بہادُر نے سہارا دے کر ملکہ کو نیچے اُتارا اور پھر اُسے الاؤ کے قریب لا کر بٹھا دیا۔ ماسٹر صاحب بھی جھجکتے ہوئے بگھّی سے اُترے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے الاؤ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

اب جو ان لوگوں کی نظر پھُول پر پڑی تو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

ملکہ: (ماسٹر صاحب سے) ماسٹر صاحب! یہ وہی لڑکی ہے جس نے چاندنی کے پھول توڑے تھے ؟

ماسٹر صاحب: ہاں ملکۂ عالیہ! یہ وہی لڑکی ہے۔

بہادُر: (پھُول سے) یہ ہماری تیسری ملاقات ہے پھُول بیٹی! ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں تو تمھیں دیکھ کر پہچان بھی نہیں سکا۔ اس لباس میں تو تم بالکل ملکہ نظر آرہی ہو۔

ملکہ: (غصّے سے دانت پیستے ہوئے) تم کیا کہہ رہے ہو بہادُر! میں تمھیں سخت سزا دوں گی۔

جنوری: اتنا غصّہ نہ دکھاؤ لڑکی! سپاہی ہمارا مہمان ہے اور تم اس کے ساتھ آئی ہو۔

ملکہ: (غصّے سے پیر زمین پر مارتے ہوئے) میں لڑکی نہیں، ملکہ ہوں ملکہ۔۔۔اور میں اس سپاہی کو اپنے ساتھ لائی ہوں۔

فروری: نہیں تم اسے ساتھ نہیں لائیں۔ یہ تو جہاں چاہے جا سکتا ہے اور تم اس کے بغیر ہل بھی نہیں سکتیں۔ ایک قدم بھی نہیں چل سکتیں۔

ملکہ: اچھّا تو میں جاتی ہوں۔

جنوری: یہ خیال نہ کرنا کہ ہم تمھیں روکنے کی کوشش کریں گے۔

ملکہ:(بہادُر سے) بہادُر! چلو بگھّی جو تو۔ ہم جا رہے ہیں۔

بہادُر: کچھ دیر ٹھہر جایئے حضور! ابھی تو سردی سے آپ کے دانت بج رہے ہیں۔ ذرا دیر آگ تاپ کر ہم روانہ ہو جائیں گے۔

یہ کہہ کر بہادُر نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے وہ شان دار بگھّی دکھائی دی جس میں چار خُوبصورت سفید گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔

بہادُر: یہ بگھّی اور گھوڑے پر بہت شاندار ہیں۔ ان کا مالک کون ہے؟

جنوری:(پھول کی طرف اشارہ کر کے) یہ لڑکی۔

بہادُر: مبارک ہو پھُول بیٹی! مبارک ہو!

بہادُر نے گدھے کو کھول دیا تھا۔ وہ بھی الاؤ کے پاس آ گیا اور پھُول کی طرف منہ کر کے زور زور سے رینکنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی کتّے نے بھی بھونکنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر بہادُر نے دونوں کے دو دو ڈنڈے لگائے اور بولا۔

بہادُر: خاموش شیطانو! چلو ہٹو یہاں سے۔

مار کھا کر گدھا اور کتّا چُپ چاپ بیٹھ گئے اور عجیب سی نظروں سے پھُول کو دیکھنے لگے۔

پھُول: (سوچتے ہوئے) ایسا لگتا ہے جیسے میں نے ان کی آواز پہلے بھی کہیں سنی ہے۔

بہادُر: یقیناً سنی ہو گی۔ تم ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتی رہی ہو نا۔

پھُول: لیکن ہمارے گھر تو کوئی گدھا یا کتّا نہیں تھا۔

بہادُر: انہیں ذرا قریب سے دیکھو پھر تم انہیں پہچان جاؤ گی۔

یہ سن کر پھُول اُٹھی اور گدھے اور کتّے کے قریب جا کر انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے جلد ہی دونوں کو پہچان لیا۔

پھُول: (حیرانی سے) میرے خُدا! یہ تو رانی اور موتی ہیں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان گدھا یا کتّا بن جائے! کسی نے ان پر جادو کیا ہے؟

جنوری: نہیں بیٹی! کسی نے ان پر جادُو نہیں کیا۔ انہیں اپنے بُرے کاموں کی سزا

مِلی ہے۔ یہ ان زیادتیوں کا بدلہ ہے جو یہ تمہارے ساتھ کرتی رہی ہیں۔

پھر جنوری نے پھُول کو سارا واقعہ سنایا۔

پھُول: کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی؟

جنوری: نہیں یہ دونوں صرف تین سال تک اس حالت میں رہیں گی۔ گدھا تمہاری لکڑیاں اور سامان ڈھویا کرے گا۔ اور کتّا تمہارے گھر کی رکھوالی کرے گا۔ اگر تین سال تک یہ نیک بنے رہے اور انہوں نے تمہیں پریشان نہیں کیا تو تم اکتیس دسمبر کو انہیں یہاں لے آنا۔ ان کی پوستینیں ان کے جسم سے اُتار دی جائیں گی اور یہ پھر انسان بن جائیں گے۔

ماسٹر صاحب: اور اگر ان تین سالوں میں بھی یہ ٹھیک نہ ہُوئیں؟

جنوری: تو پھر تین سال اور سہی۔

بہادُر: جو انسان ہو کر اپنے آپ کو نہیں سدھار سکتا، وُہ حیوان ہو کر اپنے آپ کو کہاں سدھارے گا۔ معلُوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ اسی روپ میں رہیں گی۔

پھُول:(جنوری سے) آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ اس وقت ہی ان کو انسان بنا دیں؟ انہیں گدھے اور کتّے کی شکل میں دیکھ کر مجُھے بہُت دُکھ ہُوتا ہے۔

جنوری: تمہیں اس لیے دکھ ہُوتا ہے کہ تم نیک دل ہو۔ لیکن خدانخواستہ تم گدھا یا کتّا بن جاتیں تو انہیں خوشی ہوتی۔

پھُول: کچھ بھی سہی وہ میری خالہ اور بہن ہیں۔ آپ مہربانی کیجیے اور انہیں پھر ویسا ہی انسان بنا دیجیے۔

جنوری؛ تم نادان ہو پھُول بیٹی! بالکل نادان۔ تمہیں اپنے بُرے بھلے کا پتا نہیں۔ ہم نے جو کُچھ کیا ہے وہ تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے۔ یہ تین سال انہیں گدھے اور کتّے حالت میں ہی گزارنے دو۔ اگر انہوں نے اس مدّت میں اپنے آپ کو سدھار لیا تو ہم پھر انہیں ان کی اصلی حالت پر لے آئیں گے۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

پھُول: اگر اس میں میری بھلائی ہے تو پھر میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ویسے مجھے امید ہے کہ تین سال کے اندر اندر یہ ضرور اپنے آپ کو سدھار لیں گی۔

جنوری: اچھّا! اب تم لوگوں کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔

بہادُر: ہم خود بھی جانا چاہتے ہیں بابا! لیکن اس گدھے کے ساتھ شاید ایک سال میں بھی گھر نہ پہنچ سکیں۔ یہ چلتا کم ہے اور رینکتا زیادہ ہے۔

جنوری: ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تمہاری ملکہ نے بگھّی کھینچنے کے لیے گدھا مانگا تھا سو اسے مل گیا۔

ملکہ: لیکن یہ جانور تو ہمیں گھر نہیں پہنچا سکے گا۔ہاں اس چار گھوڑوں والی بگھّی میں جگہ مل جائے تو بات بن سکتی ہے۔

جنوری: تم اس کی مالکہ سے درخواست کرو۔ وہ چاہے تو تمہیں بٹھا سکتی ہے۔

ملکہ: مجھے درخواست کرنا نہیں سکھایا گیا۔ میں صرف حکم کر دے سکتی ہوں۔ میں ملکہ ہوں۔

فروری: اچھّا! تو تم ملکہ ہو؟ اور یہ بوڑھا کون ہے؟

فروری: یہ میرے ماسٹر صاحب ہیں۔

فروری : (ماسٹر صاحب سے) تم کیسے استاد ہو کہ اسے یہ بھی نہیں سکھا سکے کہ درخواست کیسے کہ جاتی ہے۔

ماسٹر صاحب: میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

لیکن اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ ملکۂ عالیہ نے وہی کچھ سیکھا ہے جو کچھ سیکھنا چاہتی تھیں۔

ملکہ : خیر ماسٹر صاحب! اب اس بات کو جانے دیجیے۔ میں آج ایک ہی دن میں اِتنا کُچھ سیکھ گئی ہوں کہ آپ کئی سالوں میں بھی نہیں سکھا سکتا۔

یہ کہہ کر وُہ پھُول کی طرف مُڑی اور کہنے لگی۔

ملکہ : دیکھو لڑکی! تم ہمیں اپنی بگھّی میں بٹھا کر لے چلو۔ ہم تمہیں بہت سا انعام دیں گے۔

پھُول: آپ کا شکریہ ملکۂ عالیہ! مجھے آپ کے انعام کی ضرورت نہیں۔

ملکہ: دیکھا! اس نے انکار کر دیا ہے۔۔۔ میں پہلے ہی کہتی تھی۔

فروری: لیکن تم نے صحیح طریقے سے درخواست ہی کب کی ہے۔

ملکہ: تو اور کیسے کروں؟ آپ بتائیے ماسٹر صاحب

ماسٹر صاحب: آپ یوں کہیے حضور! کہ۔۔۔۔ مہربانی فرما کر ہمیں اپنی بگھّی میں بٹھا کر گھر پہنچا دیجیے۔

ملکہ: میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر پھُول کی طرف مُڑی اور اس سے بولی۔

ملکہ: مہربانی کر کے ہمیں اپنے ساتھ لے چلیے! ہم سردی سے مرے جا رہے ہیں۔

پھُول: میں آپ سب کو اپنے ساتھ لے چلوں گی اور آپ کو گرم چغے بھی دوں گی۔ میرے صندوق میں کافی چُغے ہیں۔ ابھی نکال کر لاتی ہوں۔

پھُول بگھّی کی طرف گئی اور صندوق میں سے تین چُغے نکال لائی۔

پھُول: یہ لیجیے۔۔۔۔ اور یقین رکھیے کہ میں انہیں واپس نہیں لوں گی۔

ملکہ نے ایک چُغہ ماسٹر صاحب کو دے دیا اور ایک بہادُر کو اور تیسرا خُود پہن لیا۔

بہادُر: پھُول بیٹی! تم بُہت ہی نیک لڑکی ہو۔ ملکہ نے تمہارے ساتھ اچھّا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس کے بدلے میں تم بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر سکتی تھیں۔۔۔ لیکن تم نے ان کی بُرائی کا جواب بھلائی سے دیا۔ اسی طرح تمہاری خالہ اور بہن تم پر ظلم توڑتی رہی ہیں لیکن تم اب بھی اُن کے ساتھ نیکی کرنا چاہتی ہو۔ کاش وُہ بھی تمہاری طرح نیک ہوتیں۔

جنوری: پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتی سپاہی میاں!

بہادُر: اب ہمیں اجازت دو بھائیو! خُدا حافظ۔

جنوری: ذرا سنبھل کر بیٹھنا۔ ہمارے گھوڑے بُہت تیز ہیں۔ آنکھ جھپکتے میں کہیں سے کہیں لے جائیں گے۔

پھُول: لیکن میری خالہ اور بہن کا کیا بنے گا؟

جنوری، ان کی فکر نہ کرو بھول بیٹی! انہیں تمہارے گھر پہنچا دیا جائے گا۔

پھُول: اچھّا! خدا حافظ۔ میں آپ لوگوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔

ملکہ: اور میں بھی کبھی نہیں بھولوں گی۔

ماسٹر صاحب: اور ملکہ حضور! آپ بھولیں گی بھی تو میں یاد دلا دیا کروں گا۔

پھُول، ملکہ اور ماسٹر صاحب بگھّی میں بیٹھ گئے۔ بہادُر آگے کوچوان کی نشست پر جا بیٹھا اور اس نے گھوڑوں کو اشارہ کیا تو وہ ہوا ہو گئے۔ بگھّی میں لگی ہوئی چاندی کی گھنٹیاں ٹن ٹن بجنے لگیں۔

اس کے بعد جنوری نے ملکہ کی بگھّی میں گدھے کو جوتا اور کتّے کو پکڑ کر بگھّی میں بٹھا دیا اور پھر انھیں بھی اسی راستے پر ڈال دیا۔

اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد بارہ مہینے پھر اپنے الاؤ کے گرد بیٹھ گئے اور لہک لہک کر گانے لگے۔

اے آگ تیز اور تیز جل

شعلہ ترا اُونچا رہے

اے آگ روشن ہو ذرا
کر گرم سردی کی ہوا
گرمی کے چہرے کو نکھار
دنیا میں لے کر آ بہار

اے آگ تیز اور تیز جل
شعلہ ترا اُونچا رہے

اے آگ تیز اور تیز جل
یہ برف سب جائے پگھل
سرسبز ہوں سب جھاڑیاں
اُگ آئیں پھر پھول اور پھل
اے آگ تیز اور تیز جل

شعلہ ترا اُونچا رہے

اے آگ تیز اور تیز جل
کر دے سنہری کھیتیاں
سونا ہی سونا کھیت ہوں
گندم کی جھومیں بالیاں

اے آگ تیز اور تیز جل
شعلہ ترا اُونچا رہے